طلوعِ اسلام

ادارۂ طلوعِ اسلام، کراچی

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

کراچی

قیمت فی پرچہ	خط وکتابت کا پتہ	ٹیلیفون	بدلِ اشتراک سالانہ
ہندوستان سے بارہ آنے، پاکستان سے بارہ آنے	۳/۱۵۹ پی۔ای۔سی۔ایچ سوسائٹی کراچی نمبر ۲۹	۳۱۴۸۸	ہندوستان اور پاکستان سے آٹھ روپے، غیر ممالک سے ۲۸ شلنگ

نمبر ۶ | جولائی سنہ ۱۹۵۶ء | جلد ۹

فہرست مضامین

لمعات	۲ — ۸، ۶۶ — ۷۲
ربوٰ کا مسئلہ	۹ — ۲۴
امریکہ اور یہودی	۲۵ — ۲۹
مجلسِ اقبال	۳۰ — ۴۰
قرآنی معاشرہ	۴۱ — ۵۴
باب المراسلات	۵۵ — ۵۹
طاہرہ کے نام	۶۰ — ۶۴
اشتہارات	۷۳ — ۸۰

(ضروری اعلان)

(۱) آئندہ سے پوسٹ بکس کے پتہ پر خط وکتابت نہ کی جائے (۲) اب ہمارا مستقل پتہ یہ ہے۔ تمام مکاتبت اسی پتہ پر ہونی چاہیئے

ادارۂ طلوعِ اسلام ۳/۱۵۹۔ پی۔ای۔سی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی نمبر ۲۹

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

آجکل دنیا کی قومیں اپنے پیشِ نظر مقاصد و مطامح کو خاص اسکیموں کے مطابق حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ وہ اپنے سامنے ایک نصب العین رکھتی ہیں۔ اس نصب العین تک پہنچنے کے لئے ایک عرصہ متعین کرتی ہیں اور پھر اس عرصہ کے اندر اُس منزل تک پہنچنے کے لئے ایک پروگرام مرتب کرتی ہیں۔ اسے پلاننگ (PLANNING) کہتے ہیں (جس کا عام طور پر ترجمہ منصوبہ بندی کیا جاتا ہے اگرچہ ہمارے نزدیک یہ ترجمہ پلاننگ کے صحیح مفہوم کو سامنے نہیں لاتا) مقاصد پیشِ نظر کے حصول کے لئے یہ طریقِ کار نہایت موزوں (بلکہ اس زمانے میں اشد ضروری) ہے اس سے ترقی کی رفتار ماپی جا سکتی ہے۔ سفر اور آوارگی میں فرق ہی یہ ہے کہ سفر میں منزل متعین ہوتی ہے۔ اور ہم ہر وقت اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہم اس منزل سے کس قدر قریب آ چکے ہیں۔ آوارگی میں کوئی متعین منزل سامنے نہیں ہوتی۔ اس لئے اس میں قدم تو برابر اٹھتے ہیں لیکن راستہ طے نہیں ہوتا۔

پاکستان کو وجود میں آئے قریب نو سال ہو چکے ہیں لیکن اس نے ابھی تک اپنے کاموں کے لئے کوئی پلان مرتب نہیں کیا ہے۔ مقامِ شکر ہے کہ حکومتِ پاکستان کے پلاننگ بورڈ کی طرف سے اب پہلا پلان ملک کے سامنے آیا ہے۔ لیکن اس پلان کی اشاعت بھی ہمارے دفتری نظم و نسق کی خصوصیات کی آئینہ دار ہے۔ پلان پانچ سال کے لئے ہے جس کی ابتدا یکم اپریل سنہ ۱۹۵۵ء سے ہوتی ہے یعنی اس پلان کو اپریل سنہ ۱۹۵۵ء سے شروع ہونا چاہیئے تھا لیکن عملاً حالت یہ ہے کہ پلان (نہیں بلکہ پلان کا ڈرافٹ یعنی مسودہ) مئی سنہ ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا ہے (معاف رکھئے ہم سے غلطی ہوئی) مئی سنہ ۱۹۵۶ء میں بھی پلان کا مسودہ نہیں بلکہ پلان کے موٹے موٹے خطوط (OUTLINES) کا مسودہ شائع ہوا ہے۔ اس کے بعد پلان کا مسودہ شائع ہوگا۔ اس مسودہ پر بحث و تنقید ہوگی۔ پھر وہ اپنی آخری شکل میں شائع ہوگا۔ اس کے بعد اس پر کہیں جا کر عملدرآمد شروع ہوگا۔ جس رفتار سے آجکل ہمارے دفاتر میں کام ہوتا ہے۔ اس سے کچھ عجب نہیں کہ پانچ سال کا عرصہ (یا کم از کم اس کا معتد بہ حصہ) اس پلان کی اشاعت ہی میں صرف ہو جائے یا جب تک یہ پلان اپنی آخری شکل میں شائع ہو اس وقت حالات میں ایسی تبدیلی آ جائے کہ خود اس پلان کو بدلنے کی ضرورت محسوس ہو۔ غور کیجئے کہ جس پلاننگ کی ابتدا اس طرح ہو۔ اس کی تکمیل کے متعلق کوئی اپنے آپ کو کس حد تک خوش فہمی میں مبتلا رکھ سکتا ہے!

قیاس کن ز گلستانِ من بہارِ مرا

دوسری بات قابلِ غور یہ ہے کہ پلاننگ کی بنیاد ہمیشہ اعداد و شمار پر ہوتی ہے۔ جس قدر اعداد و شمار قابلِ یقین ہوں گے اسی قدر اس پلان کی تکمیل یقینی ہوگی۔ کسی ملک کے ذرائع و وسائل میں انسانی قوت (MAN-POWER) کو جس قدر اہمیت حاصل ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ لہٰذا پلاننگ کے اعداد و شمار میں اس اطلاع (INFORMATION) کا ہونا نہایت ضروری ہے کہ ہمارے ہاں بیکاروں کی تعداد کس قدر ہے۔ تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ فلاں اسکیم کو بروئے کار لانے کے لئے ہمیں مناسب آدمی بھی مل سکیں گے یا نہیں۔ یا ان بیکاروں کو کام پر لگانے کے لئے ہمیں کس کس قسم کی اسکیمیں بنانی چاہئیں۔ اس باب میں پلان زیرِ نظر کے مسودہ میں شروع ہی میں اس امر کا اظہار کر دیا گیا ہے کہ

> گزشتہ چند سالوں میں مختلف صنعتوں اور پیشوں میں کتنے بیکار آدمیوں کی کھپت ہوئی ہے اور اس میں کس قدر اضافہ ہوا ہے۔ اس کے متعلق کوئی قابلِ یقین اطلاع موجود نہیں۔ نہ ہی ہم اس امر کا کوئی قابلِ وثوق اندازہ لگا سکتے ہیں کہ پلان کے پانچ سالہ عرصہ میں کیا کیا تبدیلیاں ہوں گی۔ دیہاتی علاقوں میں کس قدر بیکاری ہے۔ اس کے متعلق سرے سے کوئی اطلاع ہی موجود نہیں۔

آدمیوں کے بعد ملک میں مویشیوں کی اہمیت ہوتی ہے۔ اس ضمن میں پلان میں لکھا ہے کہ

> ملک میں مویشیوں کی تعداد کس قدر ہے۔ اس کے متعلق بھی کوئی اطلاع موجود نہیں کیونکہ ۱۹۴۵ء کے بعد مکمل مویشی شماری ہی نہیں کی گئی۔

کس قدر افسوسناک و المناک انگیز ہے یہ حالت کہ کسی ملک کو یہ بھی معلوم نہ ہو کہ اس میں بیکاری اور بیروزگاری کا کیا عالم ہے۔ اور ان بیکاروں میں کس کس فن اور حرفے کے موزوں افراد موجود ہیں۔ یا اس میں مویشیوں کی تعداد کتنی ہے کتنے ہر سال پیدا ہوتے ہیں اور ختم کر دیئے جاتے ہیں یا ختم ہو جاتے ہیں۔ جس ملک کی حکومت نو سال کے عرصہ میں اتنا بھی نہ کر سکی ہو۔ اس ملک کے متعلق اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ

خدا ایں سخت جاں را یار بادا کہ افتاد است از بام بلندے

اس تمہیدی تعارف کے بعد ہم اصل پلان کی طرف آتے ہیں۔ لیکن اس تمہید سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ہم اس پلان پر تخریبی تنقید کی نگاہ سے تبصرہ کر رہے ہیں۔ تخریبی تنقید ہمارے نزدیک بہت بڑا جرم ہے۔ جس کا مرتکب طلوعِ اسلام کبھی نہیں ہو سکتا۔ پاکستان کا حصول طلوعِ اسلام کے لئے جزوِ ایمان رہا ہے۔ اور اب اس کے استحکام کی کوشش اس کا مقصدِ زندگی۔ اس لئے اس کی ہر تنقید تعمیر کے لئے ہوتی ہے اور اس کی نکتہ چینی اور سقام شماری اصلاح کی خاطر۔ لہٰذا اربابِ متعلقہ کی خدمت میں ہماری گذارش ہے کہ وہ ہماری تنقید کو اسی نقطۂ نظر سے دیکھیں۔ ہم سب (پاکستانی) ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ اگر کشتی کا کوئی مسافر بتاتا ہے کہ کشتی میں فلاں جگہ سوراخ ہے تو اس سے کشتی کے ملاحوں کو برا نہیں منانا چاہیئے۔ اس سوراخ کے بند کرنے کی تدابیر سوچنی چاہئیں۔ اس مقام پر اتنا اضافہ اور بھی ضروری ہے کہ ہم نے پلان کے صرف اقتصادی پہلو ہی کو سامنے نہیں رکھا اس کے معاشرتی گوشوں کا بھی جائزہ لیا ہے بلکہ ان گوشوں کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ اس لئے کہ اقتصادی ترقی سے مقصود بھی معاشرتی فلاح و بہبودی ہوتی ہے۔ اس ضمن میں بعض امور ایسے بھی سامنے آئیں گے جن کا تعلق براہِ راست اس پلان سے نہیں بلکہ مملکت کے دوسرے شعبوں سے ہے جن میں اصلاح

وترمیم کی اشد ضرورت ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ ہماری ہر تنقید اور ہر تجویز قرآن کریم کی تعلیم پر مبنی ہوتی ہے۔ اس لئے اس تبصرہ کا قرآن ہی کی روشنی میں مطالعہ کیا جانا ضروری ہے۔

دیہی اصلاح

پلان میں درج شدہ اطلاعات کے مطابق (جو ۱۹۵۱ء کی مردم شماری پر مبنی ہے) پاکستان کی آبادی کا قریب نوے فیصدی حصہ دیہات میں آباد ہے۔ اس لئے اس پلان میں دیہاتی آبادی کی فلاح و بہبود اور اصلاح و تربیت پر خاص زور دیا گیا ہے۔ ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے تھا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ اس مقصد کے لئے کوئی ایسی تجویز پیش نہیں کی گئی جو ہمارے ملک کے حالات کے لئے موزوں و مناسب ہو۔ اس میں سارا زور (VILLAGE AID) پر دیا گیا ہے (جس کا غلط العام ترجمہ دیہی امداد کیا جاتا ہے) یہ اسکیم امریکہ کی وضع کردہ ہے اور مغربی ممالک کے دیہات کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ مغربی ممالک (بالخصوص انگلینڈ اور امریکہ) کے دیہات اور ہمارے دیہات کی حالت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ مغربی ممالک کے دیہات میں کوئی شخص بنیادی ضروریات زندگی سے محروم نہیں۔ تا ابتدائی درجہ تک تعلیم لازمی ہوتی ہے۔ حکومتوں کی طرف سے صدیوں کی مسلسل محنت کے بعد، ان کا عام معیار زندگی (بالخصوص معیار صحت) بلند ہو چکا ہے۔ زراعت کے سلسلہ میں انہیں نہ صرف مراعات حاصل ہیں بلکہ حکومت خود نت نئے تجربے کرتی رہتی ہے۔ جن سے کم از کم خرچ سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل ہو۔ ان کی پیداوار کی فروخت کے لئے منڈیوں کا خاص انتظام ہے۔ اور سلب و نہب (EXPLOITATION) کی روک تھام کا مناسب اہتمام۔ ان حالات میں ان لوگوں کے لئے تھوڑے سے فنی مشورے اور ذرا سی مالی امداد بھی ان کی زرعی اور صنعتی ترقی کے لئے کافی نشوونما کا موجب بن جاتی ہے۔ امریکن اسکیم اپنے حالات کو سامنے رکھ کر مرتب کی گئی ہے۔ اس اسکیم کو اگر ہم اپنے ہاں کے دیہات میں رائج کرنے بیٹھ جائیں تو اس کا جو نتیجہ ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اس سے پیشتر ہم نے (مغرب ہی کی نقالی میں) اپنے دیہات میں امداد باہمی (کو آپریٹو سوسائٹیز) کی اسکیم کو جاری کر کے دیکھ لیا ہے کہ وہ کس درجہ ناکام ثابت ہوئی ہے۔ اسی طرح ہمارے ہاں دیہات سدھار اور پنچایت کی اسکیمیں بھی جس بری طرح فیل ہوئی ہیں وہ تجربہ ہمارے سامنے ہے۔ اب انہی خطوط پر "دیہی امداد" کی اسکیم کو رائج کرنا "آزمودہ را آزمودن" کے سوا اور کیا ہے! ہمیں امریکہ سے روپیہ تو (مفت) مل گیا۔ لیکن اس روپے کے موزوں اور نتیجہ خیز مصرف کے لئے ذہنی کاوش اور فکری جہد کی ضرورت تھی۔ لیکن ہمارے ہاں اس قسم کی کاوش اور محنت کون کرے؟ ہم نے ایک منسٹری قائم کر لی اور یہ روپیہ اس کے حوالے کر دیا۔ اب اس کا کام یہ ہے کہ اس روپے کو کسی نہ کسی صورت ختم کرے۔ وہ روپیہ ختم کر رہی ہے۔ باقی رہا نتیجہ! سو وہ (مسلمانوں کے عقیدہ کے مطابق) خدا کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ انسان اس میں کیا کر سکتا ہے! "انسان" کانفرنسیں منعقد کر سکتا ہے۔ بیانات دے سکتا ہے۔ شاندار رپورٹیں مرتب کر سکتا ہے۔ سو اس باب میں ہم کسی سے پیچھے نہیں۔

معاف رکھئے! یہ کام منسٹری کے ٹھنڈے ٹھنڈے کمروں میں، نرم و نازک کرسیوں پر بیٹھنے والوں کے بس کا نہیں۔ یہ کام ان "دیوانوں"

لے: VILLAGE AID میں A.I.D. کے تین حروف مخففات ہیں (AGRICULTURAL AND INDUSTRIAL DEVELOPMENT) کے جن کا ترجمہ زرعی اور صنعتی نشوونما ہے۔

سکا ہو۔ جو دل میں انسانیت کا درد لئے مئی اور جون کی چلچلاتی دھوپ اور نومبر اور دسمبر کی کڑکڑاتی سردی میں گاؤں گاؤں پھریں ایک ایک شخص کی حالت کا مطالعہ کریں۔ دیہاتیوں کی زندگی اور ان کی مشکلات کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں۔ ان کے اندر رہیں سہیں اور انہی جیسی زندگی بسر کریں اور اس کے بعد سوچیں کہ ان کی مصیبتوں کا حل کیا ہو سکتا ہے۔ دیہی امداد کا روپیہ صرف اس طرح نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔ نہ کہ اس صورت میں جس میں یہ اب صرف ہو رہا ہے۔ اس سے کون سے نتائج کی توقع کی جا سکتی ہے؟

جنوں نہ داری و ہوئے فگندۂ در شہر
سبو شکستی و بزم شبانہ می خواہی؟

ان اسکیموں سے متعلقہ افسر جس انداز سے گاؤں میں جا کر جلسے کرتے اور کھیل تماشے رچا کر واپس آجاتے ہیں، اسے دیکھ کر ان گاؤں والوں کی مفلسی اور زبوں حالی ایک تمسخر آمیز ہنسی ہنستی اور ان مشفقین کرام سے پوچھتی ہے کہ

بہ جہانِ دردمنداں تو بگو چہ کار داری | تبِ تاب ناشناسی! دلِ بیقرار داری؟
چہ خبر تراز اشکے کہ فرو چکد ز چشمے | تو بہ برگِ گل ز شبنم دُرِ شاہوار داری؟

ہمارے دیہات کی حالت جس نازک ترین مرحلہ تک پہنچ چکی ہے۔ اس کے اگلے قدم کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ لیکن ہمارے ارباب نظم و نسق ان طوفانوں کا مقابلہ کاغذی ناؤ سے کرنا چاہتے ہیں۔ وَمَا يَخْدَعُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ۔

صنعت کاری

پلان میں کہا گیا ہے کہ گزشتہ چند سالوں میں ملک میں صنعتی ترقی کی رفتار بہت تیز رہی ہے۔ اس پلان میں اس رفتار کو تیز تر کرنے کی تجویز کی گئی ہے بشرطیکہ وہ ترقی متوازن ہو۔

اس میں شبہ نہیں کہ ملک کی ترقی کا راز متوازن صنعتی ترقی میں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس توازن کو برقرار رکھنے کے لئے طریق کار کیا تجویز کیا گیا ہے۔ پلان میں جو کچھ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اس پروگرام کی تکمیل کے لئے زیادہ سے زیادہ بھروسہ انفرادی اور ذاتی کارخانہ داری (PRIVATE ENTERPRISE) پر کیا گیا ہے چنانچہ اس ضمن میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ پاکستان انڈسٹریل ڈویلپمنٹ کارپوریشن اپنی مشینری اور کارخانوں کو ذاتی ملکیتوں میں دینے کے طریق عمل کو جاری رکھے گی۔ یعنی مملکت کی پالیسی یہ ہوگی کہ ملک کے صنعتی ادارے ذاتی ملکیتوں میں رہیں۔ توازن کے معنی یہ ہیں کہ کارخانے ان چیزوں کو پیدا کریں جن کی ملک کو ضرورت ہے۔ نہ کوئی چیز ضرورت سے زیادہ پیدا کی جائے نہ کم لیکن اقتصادیات کے ادنے طالب علم بھی اس حقیقت سے باخبر ہیں کہ جب صنعتی ادارے ذاتی ملکیت میں ہوں تو وہ یہ نہیں دیکھتے کہ ملک کو کن چیزوں کی ضرورت ہے وہ یہ دیکھتے ہیں کہ زیادہ سے زیادہ منافع کن چیزوں کے تیار کرنے میں ہے۔ لہٰذا کارخانوں کو ذاتی ملکیتوں میں دے کر متوازن صنعتی ترقی کی امید رکھنا کچھار دم بریدہ کے مرادف ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ صنعتی اداروں کے مالکوں کو مملکت کی پالیسی کے تابع چلنا ہوگا لیکن اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ خود ملک کی پالیسی متعین کرنے میں ان کارخانہ داروں کا کس قدر ہاتھ ہے؟ اور تو اور امریکہ جیسے ملک میں بھی پریذیڈنٹ کو یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ ملک کے سرمایہ داروں اور کارخانہ داروں کا رجحان کس طرف ہے؟ وہ ان کی مرضی کے خلاف جا کر

الیکشن نہیں جیت سکتا۔ وہ اپنی ہستی کے لئے ان کا دستِ نگر ہوتا ہے۔ جب امریکہ جیسے ملک میں سرمایہ داروں کے اثر کا یہ عالم ہے تو آپ اپنے ہاں اس کی کس طرح توقع رکھ سکتے ہیں کہ ملک ایسی پالیسی اختیار کر سکے گا جو کارخانہ داروں کے خلاف جائے اور یہ لوگ اس پالیسی کا اتباع کریں گے؟ صنعتی ترقی میں توازن قائم رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ کارخانے مملکت کی تحویل میں رہیں نہ کہ انفرادی ملکیت میں۔ انفرادی ملکیت کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس ایک مثال سے لگائیے کہ ملک میں کپڑے کی پیداوار ضرورت سے زائد (OVER-PRODUCTION) بتائی جاتی ہے لیکن ملک کے عام باشندوں کو تن ڈھانپنے تک کو کپڑا نصیب نہیں ہوتا۔ یاد رکھئے جب تک ہم حقائق کا سامنا ہمت اور جراٴت سے نہیں کرتے اور محض تقلیدی روش میں بہے جانے کا نام ترقی رکھ لیتے ہیں۔ اس وقت تک ہمارا کوئی پلان حقیقی اصلاح نہیں کر سکتا۔ اس قسم کے پروگراموں سے امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا جائے گا۔

صحت

صحت کی بہتری کے لئے پلان میں کہا گیا ہے کہ ملیریا اور تپ دق کی روک تھام کے لئے مناسب تدابیرِ عمل میں لائی جائیں گی۔ میڈیکل ریسرچ (طبی تحقیقات) حفظانِ صحت سے متعلق تعلیم، ہسپتال اور دواخانوں کی تعداد میں اضافہ اور دیگر اس قسم کے اقدامات کئے جائیں گے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ تمام تجاویز مناسب اور ضروری ہیں لیکن ان سے کہیں زیادہ اہم امور اور ہیں جن کا پلان میں ذکر تک نہیں۔ طبی امداد اور دوائیاں بیماری کا علاج ہیں۔ صحت کا مدار ان چیزوں پر نہیں ہوتا۔ صحت کا مدار ہے متوازن غذا اور صحت مندانہ طریقِ بود و ماند پر۔ ہمارے ملک میں حالت یہ ہے کہ متوازن غذا تو ایک طرف، ملک کی بیشتر آبادی کو پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا۔ باقی رہا رہنے سہنے کا طریق، سو اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ ایک کراچی میں لاکھوں انسان ان جھونپڑیوں میں بستے ہیں جن میں انسان تو انسان حیوان تک بھی تندرست نہیں رہ سکتے جب تک آپ ملک کے باشندوں کی روٹی اور مکانات کا انتظام نہیں کرتے۔ آپ ان کی صحت کو کس طرح ٹھیک رکھ سکتے ہیں؟ دوسرے یہ کہ ایلوپیتھک طریقِ علاج جسے ملک میں خود حکومت کی حوصلہ افزائی (PATRONAGE) حاصل ہے اس قدر گراں ہے کہ وہ ہمارے جیسے غریب ملک کے لئے کبھی سود مند ثابت نہیں ہو سکتا۔ ہمارے لئے صحیح پلان یہ ہونا چاہیئے کہ جراحی (SURGERY) کے لئے تو مغربی طریق سے فائدہ اٹھایا جائے۔ لیکن طبی علاج کے لئے سستے طریقِ علاج (مثلاً ہومیوپیتھی) کی نشو ونما کی جائے۔ اس کے لئے حکومت کی طرف سے کالج کھولے جائیں اور تحقیقاتی ادارے اور دواسازی کے کارخانے قائم کئے جائیں۔ اس وقت یہ طریقِ علاج محض اس لئے بچوں کا کھلونا دکھائی دیتا ہے کہ یہ اَن پڑھوں اور نااہلوں کے ہاتھ میں ہے اور اس کی ذمہ داری بھی حکومت پر ہے جس نے اس طرف توجہ نہیں دی ورنہ جہاں تک اصولِ علاج کا تعلق ہے یہ طریق محکم بنیادوں پر استوار ہے۔ اس باب میں بھی ہمیں تقلید و تعصب کی بجائے تحقیق و تدبر سے کام لینا چاہیئے لیکن جب تک یہ نہ ہو کم از کم اتنا ہی کیا جائے کہ ایلوپیتھی کی دوائیاں حکومت کی زیرِ نگرانی اپنے ملک میں تیار کی جائیں۔

مکانات

مکانات کی تعمیر کے سلسلے میں پلان میں کہا گیا ہے کہ حکومت مناسب مقامات پر بنیادی ضروریات (واٹر سپلائی۔ سڑکیں گندی نالیوں وغیرہ) کا انتظام کر کے قطعاتِ اراضی لوگوں کو دیدے تاکہ وہ ان پر خود مکانات تعمیر کر سکیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس طریق کار میں اجتماعی مفاد مضمر ہے۔ لیکن اس کا جو تجربہ بعض ہاؤسنگ سوسائٹیز کی صورت میں ہوا ہے۔ وہ بڑا ہی تلخ ہے مثلاً کراچی

کی پاکستان ایمپلائز ہاؤسنگ سوسائٹی کو لیجئے۔ اس سوسائٹی کا نظم ونسق بالعموم مرکزی حکومت کے افسران بالا کے ہاتھ میں رہا ہے لیکن کروڑوں روپے خرچ ہو جانے کے بعد بھی اس علاقے کی جو حالت ہے وہ ہر اس شخص کے سامنے آجاتی ہے جو ایک بار بھی اس میں سے سرسری طور پر گذر جائے ایک اسلامی مملکت میں ہر شخص کے لئے مکان مہیا کرنا حکومت کا فریضہ ہوتا ہے۔ سو اول تو خود حکومت کو اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا چاہیئے۔ لیکن جب تک حکومت کے وسائل اس کی اجازت نہیں دیتے، اسے کم از کم اتنا ہی کرنا چاہیئے کہ ہر شخص کو اس کی ضروریات کے مطابق مکان تیار کر کے دے۔ اور اس کے کرایہ کو لاگت کی طرف محسوب کر کے آخرالامر مکان کو مکین کے حوالے کر دے۔

براڈ کاسٹنگ

براڈ کاسٹنگ کی مشینری کو وسیع کرنے کے لئے پلان میں ضروری تجاویز پیش کی گئی ہے۔ تجاویز معقول ہیں اور ضرورت پر مبنی۔ دور حاضر میں براڈ کاسٹنگ نہایت عمدہ ذریعہ نشر واشاعت ہے اور اسے جس قدر وسیع کیا جائے کم ہے۔ لیکن یہ ضرورت صرف اس سے پوری نہیں ہو سکتی کہ ہم چار کی جگہ دس اسٹیشن کھول دیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ ان اسٹیشنوں سے براڈ کاسٹ کیا ہوتا ہے؟ زندہ ممالک میں اس ذریعہ نشر واشاعت سے قوم کی تعلیمی اور ذہنی تعمیر کا کام لیا جاتا ہے۔ اس تعمیر میں آرٹ (موسیقی ڈرامہ وغیرہ) کا بھی مناسب حصہ ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں تعلیم وتربیت کا تو ذکر ہی کیا، جہاں تک محض تفریح کا تعلق ہے ہمارے پروگراموں کی حالت یہ ہے کہ ایک صاحب ایک دن ریڈیو سیٹ پر کوئی اسٹیشن تلاش کر رہے تھے پاس بیٹھے ہوئے دوست نے پوچھا کہ کون سا اسٹیشن مطلوب ہے۔ انہوں نے کہا کہ کراچی ریڈیو اسٹیشن۔ اس نے کہا کہ اس کے تلاش کرنے میں کیا وقت ہے۔ گھنڈی گھماتے جاؤ جس آواز پر جی یہ چاہے کہ ریڈیو سیٹ اٹھا کر باہر سڑک پر پھینک دوں، وہی کراچی ہوگا۔ اس نے یہ بات تو مزاحاً کہی لیکن ہے بالکل حقیقت پر مبنی۔ لہٰذا اگر اس قسم کے اسٹیشن چار کے بجائے دس ہو جائیں تو سوائے اس کے کہ بدمذاقی اور عام ہو، اس سے حاصل کیا ہوگا؟ ضرورت اس کی ہے کہ اس شعبہ کو ان لوگوں کے ہاتھ میں دیا جائے جو اعلیٰ درجے کے تعلیم یافتہ اور نہایت سلجھے ہوئے مذاق کے حامل ہوں۔ ان کا مقصد عوام کے سطحی ذوق کی تسکین نہ ہو بلکہ نشری تعلیم وتربیت سے ان کے ذوق کی سطح کو بلند اور ان کے علمی احاطہ کو وسیع کرنا ہو۔

تعلیم

اگر کسی نے اس بات کا اندازہ لگانا ہو کہ کسی قوم کا مستقبل کیا ہے تو اسے دیکھنا یہ چاہیئے کہ اس قوم کے تعلیمی ادارے کیسے ہیں یہی وہ کارگہ ہیں جن میں قوم کے معقولات کے سانچے ڈھلتے ہیں۔ جس قسم کی کسی قوم کے بچوں کی تعلیم وتربیت ہوگی۔ اسی قسم کا اس کی آئندہ نسل کا کردار وعمل ہوگا۔ ہم نے اس نو سال کے عرصہ میں جو سب سے بڑا قومی جرم اور انسانیت کا گناہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کی طرف سے بری طرح اعراض برتا ہے۔ جہاں تک صرف تعداد کا تعلق ہے۔ قوم کے بچوں کا پچاس فیصدی حصہ محض اسکولوں میں جگہ نہ ہونے کی وجہ سے تعلیم حاصل نہیں کر رہا۔ جہاں تک نصاب کا تعلق ہے حالت اس سے بدتر ہے انگریز جس قسم کا نصاب ہمیں ورثہ میں دے گیا تھا۔ وہی ابھی تک ہماری درسگاہوں میں رائج ہے۔ اس فرق کے ساتھ کہ اس کے معیار میں اب خاصی پستی آچکی ہے۔ اور یہ ترقی معکوس ہر سال بڑھتی جا رہی ہے۔ پلان میں، اسکولوں اور کالجوں کے بڑھانے اور ٹرینڈ اساتذہ کی تعداد میں اضافہ کرنے

کی تجاویز شامل ہیں۔ یہ امر موجبِ اطمینان ہے۔ لیکن اس سے قوم کے اصل مرض کا علاج نہیں ہو سکتا۔ اس کا علاج نصابِ تعلیم کے بدلنے سے ہوگا۔ جہاں تک عصرِ حاضر کے علوم کی تعلیم کا تعلق ہے۔ اس کے لئے ہم یقیناً مغرب کی اعلیٰ درس گاہوں کے نصاب سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ لیکن اس سے کہیں زیادہ ضرورت اس تعلیم کی ہے جو ہمارے بچوں کے قلب و دماغ کو صحیح اسلامی قالب میں ڈھال سکے۔ اگر ہم ایسا نہیں کر سکتے تو ہماری مملکت کے اسلامی ہونے کا کچھ بھی مطلب نہیں۔ اس مقصد کے لئے قرآن کریم اور سیرت نبی اکرمؐ کی تعلیم لاینفک ہے۔ قرآن کی تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ اسے عصرِ حاضر کے علوم کی روشنی میں سمجھا جائے۔ اور اس حقیقت کو علیٰ وجہ البصیرت سامنے لایا جائے کہ انسانی زندگی کے جن بنیادی مسائل کو تنہا عقلِ انسانی حل نہیں کر سکی، نہ کر سکتی ہے، قرآن کریم ان مسائل کا حل کیا بتاتا ہے۔ اور حضور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ کی تعلیم سے مطلب یہ ہے کہ یہ بتایا جائے کہ قرآن کریم جس قسم کے انسانی معاشرے کا تصور دیتا ہے۔ حضورؐ نے اسے کس طرح متشکل فرمایا اور اپنے زیرِ تربیت انسانوں کے دل و دماغ میں وہ تبدیلی کس طرح سے پیدا کر دی۔ جس سے وہ سیرت و کردار کی بلند ترین سطح تک پہنچ گئے۔

تعلیم کے سلسلہ میں یہ بھی ضروری ہے کہ دینی مدارس اور دنیاوی اسکولوں اور کالجوں کی جو غیر اسلامی ثنویت ہمارے ہاں صدیوں سے چلی آرہی ہے اسے مٹایا جائے۔ اور ہمارے اسکول اور کالج 'دین اور دنیا' دونوں سے متعلق تعلیم کے مراکز ہوں۔ پلاننگ کے معنی یہ نہیں کہ جو کچھ اس وقت ہو رہا ہے اس میں اضافہ کر دیا جائے۔ پلاننگ سے مفہوم یہ ہے کہ ماحضر موجود پر گہری تنقیدی نگاہ ڈالی جائے۔ جو کچھ علیٰ حالہٖ رکھے جانے کے قابل ہے اسے رکھا جائے جو کچھ مٹائے جانے کے قابل ہے اسے مٹایا جائے۔ اور اس طرح اپنے مخصوص تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے نئی راہیں متعین کی جائیں۔ جب تک ہم فرسودہ اور پامال راہوں سے ہٹ کر اپنے تیشہ سے اپنا جادہ آپ نہیں تراشیں گے منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکیں گے۔ ہمیں افسوس ہے کہ زیرِ نظر پلان میں ہمیں جدتِ نظر اور ندرتِ فکر کی کوئی جھلک دکھائی نہیں دیتی۔ وہی پرانی لکیریں ہیں جنہیں اور گہرا اور وسیع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگرچہ اس حقیقت کا اطلاق زندگی کے تمام شعبوں پر یکساں طور پر ہوتا ہے لیکن تعلیم کے سلسلہ میں کورانہ تقلید ہمیں کبھی صحیح منزل تک نہیں پہنچا سکتی۔ زیرِ نظر پلان میں جو کچھ تجویز کیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ تعلیم کی مد میں جس قدر روپیہ اس وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اس میں پچاس ساٹھ کروڑ کا اور اضافہ ہو جائے گا۔ جو مسافر غلط راستے پر چل رہا ہو اسے اگر تانگے کی جگہ موٹر میں بٹھا لیا جائے تو کیا اس کا نام ترقی اور نیل المرام (ACHIEVEMENT) ہوگا؟۔

پلان میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ملک میں تحقیقاتِ اسلامیہ کے ادارے قائم کئے جائیں گے۔ اور جو پہلے سے موجود ہیں انہیں تقویت دی جائے گی۔ نئے اداروں کے متعلق تو خیر بعد میں دیکھا جائے گا۔ اس مقصد کے لئے جو ادارے موجود ہیں اگر ان کا کچھ تعارف کرا دیا جاتا تو اس سے اندازہ ہو جاتا کہ تحقیقاتِ اسلامیہ سے مقصود کیا ہے؟ اس وقت ہماری حالت یہ ہے کہ جسٹس منیر کی تحقیقاتی عدالت میں اسلامی علوم کے بڑے بڑے علمبردار اتنا بھی نہیں بتا سکے تھے کہ 'مسلمان' کسے کہتے ہیں کیا اسلامیات کی ریسرچ انہی یا انہی جیسے اور دیگر حضرات کے ہاتھوں ہوگی؟ ہمارا ملک بڑا غریب ہے۔ یہاں ایک ایک پائی اشرفی سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ اس لئے ہمیں ایک پیسہ خرچ کرنے سے پہلے دس مرتبہ سوچنا چاہیئے کہ اس سے حاصل کیا ہوگا۔ محض 'ثواب' یا نیک نامی کی خاطر روپیہ خرچ کرنے کی ہمارے ہاں کہاں گنجائش ہے؟

(باقی صفحہ ۶۶ پر دیکھئے)

معاشی مسئلہ کا قرآنی حل

روٹی کا مسئلہ

[گذشتہ اپریل میں محترم پرویز صاحب، خرابیٔ صحت کی بناء پر۔ بغرضِ تبدیلیٔ آب و ہوا، عازمِ سوات ہوئے۔ لیکن دسفر کی صعوبت کو کم کرنے اور احباب سے ملنے کی غرض سے، راستے میں، لاہور، سیالکوٹ، راولپنڈی ٹھہرتے ہوئے گئے۔ ہرچند ان کی صحت خراب تھی۔ لیکن ہر مقام پر احباب کا تقاضا ہوا کہ وہ کم از کم ایک عام تقریر کرتے ہوئے آگے جائیں۔ چونکہ معاشی مسئلہ کو آجکل بڑی اہمیت حاصل ہے اور محترم پرویز صاحب نظامِ ربوبیت کے قرآنی تصور سے اس مسئلہ کو نکھار کر سامنے لائے ہیں اس لئے ہر مقام پر تقاضا یہی ہوا کہ وہ معاشی مسئلہ کے قرآنی حل پر خطاب فرمائیں۔ چنانچہ انھوں نے اسی موضوع پر ان مقامات پر تقریریں کیں۔ ان تقاریر کے نوٹس (NOTES) سے ایک مسلسل تقریر مرتب کر لی گئی ہے جسے قارئین طلوعِ اسلام کے افادہ کی غرض سے درجِ ذیل کیا جاتا ہے۔ طلوعِ اسلام]

شائع کردہ: ادارہ طلوعِ اسلام ۱۵۹/۳۔ ایل۔ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ سوسائٹی کراچی ۲۹

بسم اللہ الرحمن الرحیم :

برادرانِ عزیز! جس موضوع پر مجھے تقریر کرنے کے لئے کہا گیا ہے۔ عام الفاظ میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ مذہب کی رو سے روٹی کے مسئلہ کا حل کیا ہے؟ یہ عنوان اکثر احباب کے لئے وجہ صد استعجاب ہوگا۔ اس لئے کہ روٹی کا مسئلہ خالص دنیاوی مسئلہ ہے جسے مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ مذہب کا تعلق دنیا سے نہیں بلکہ آخرت سے ہے۔ اور اس کا مقصود انسانی نجات ہے۔

مذہب اور روٹی

نجات کس سے؟ ان بندھنوں سے جن میں انسان پھنسا ہوا ہے۔ ان مصیبتوں سے جن میں ابن آدم مبتلا ہے۔ ان مشکلات سے جن میں ہر فرد انسانیہ گرفتار ہے۔ ان کثافتوں اور غلاظتوں سے جن میں فرزند آدم ملوث ہے۔ یہ مصیبتیں اور مشکلیں کیوں پیدا ہوتی ہیں؟ دنیاوی حرص و ہوس سے، زن و فرزند کی جاذبیتوں سے۔ مال و متاع کی دلکشی سے۔ روٹی کے پیچھے دوڑنے سے! اور یہ کثافتیں اور غلاظتیں کیا ہیں؟ مادی دلدل کی آلائشیں جو روح کو ناپاک اور انسان کی معصوم فطرت کو گنہگار بنا دیتی ہیں۔ ان مصیبتوں اور مشکلوں سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ انسان دنیا سے دور بھاگے۔ یہاں کی جاذبیتوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھے۔ فطرت کی ہر حسین شے کو غارت گرِ روحانیت تصور کرے۔ دنیا کی ہر کشش کو ابلیس کا بلاوا سمجھے۔ یہی وجہ تھی کہ بدھ مت نے کہا کہ انسان کی ہر آرزو تکلیف کا پیش خیمہ ہے اور حقیقی راحت ترک آرزو میں ہے۔ اسی بناء پر ہندو دھرم نے بتایا کہ دنیا مایا (فریب) ہے جس میں پھنسنے والا احمق ہے۔ اس کے تتبع میں عیسائیت نے کہا کہ دنیا میں ہر ابن آدم اپنے اولیں ماں باپ کے گناہوں کی سزا بھگتنے کے لئے آتا ہے۔ لہٰذا اس سے جتنا دور بھاگا جائے اتنا ہی انسان عافیت میں رہتا ہے۔ آسمان کی بادشاہت غریبوں اور ناداروں کے لئے ہے۔ اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گزر جانا ممکن ہے۔ لیکن کسی امیر آدمی کا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا ناممکن ہے جتنا کوئی شخص مفلس و نادار، برباد و تباہ حال، مسکین و بے بس، محتاج و لاچار، ضعیف و ناتواں ہوگا اتنا ہی وہ خدا کا مقرب ہوگا۔ بھوک سے چہرے زرد۔ پھٹے پرانے کپڑے۔ ژولیدہ مو۔ پریشان حال۔ جسم گرد و غبار سے اٹا ہوا۔ افسردہ خاطر۔ پژمردہ رو۔ یہ ہیں مقربین بارگاہ خداوندی کی نشانیاں۔ یہ ہے برادران! وہ تصور جو مذہب، دنیا اور اہل دنیا کے متعلق پیش کرتا ہے۔ لہٰذا جن حضرات کے دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ مذہب کو روٹی کے مسئلہ سے کیا تعلق! وہ بالکل حق بجانب ہیں۔

لیکن دنیا اور مسائل حیات سے متعلق یہ تصورات انسانوں کے خود ساختہ مذہب کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ اسے خدا کی طرف سے عطا فرمودہ دین سے کوئی واسطہ نہیں۔ خدا کا دین اس قسم کے تصورات پیش کرنے والوں کو للکارتا ہے۔ اور پوری تحدی سے کہتا ہے

دین اور روٹی

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِينَةَ اللَّهِ الَّتِي أَخْرَجَ لِعِبَادِهِ وَالطَّيِّبَاتِ مِنَ الرِّزْقِ (۷/۳۲) ان سے پوچھو کہ وہ کون ہے جو ان زینت و آرائش کی چیزوں کو جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے۔ اور خوشگوار سامان حیات کو حرام قرار دیتا ہے؟

آپ نے دیکھا برادران! کہ قرآن نے کس طرح ایک ہی آیت سے انسانوں کے خود ساختہ مذہب کی نگاہ فریب عمارتوں کو بنیاد سے اکھیڑ کر رکھ دیا! اس آیت میں اس نے اشیائے زینت کا اجمالی ذکر کیا ہے۔ دوسری جگہ اسی اجمال کی تفصیل ان الفاظ میں بیان کر دی ہے کہ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ

الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ .... (۳/۱۴) زن و فرزند کی محبت، سونے چاندی کے ڈھیر، عمدہ پلے ہوئے گھوڑے، مال مویشی کھیتی باڑی۔ ان تمام چیزوں کو انسانوں کے لئے وجہ زینت بنایا گیا ہے۔ لہٰذا وہ تصورِ حیات جو ان چیزوں کی کشش و تمتع کو حرام قرار دیتا ہو غیر خداوندی تصور ہے۔ خدا کے دین کا عطا کردہ تصور نہیں۔ قرآن نے آدم (یعنی آدمی) سے کہہ دیا کہ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ (۲/۳۶) تمہیں ایک مدت تک اس دنیا میں رہنا ہے لہٰذا اس سروسامان سے فائدہ اٹھانا ضروری ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس سے آگے بڑھئے تو یہاں تک کہہ دیا کہ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ جَمِيْعًا (۴۵/۱۳) اس کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے ہم نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ کارگہ عالم کی ہر شے قانون خداوندی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ انسان کا کام یہ ہے کہ وہ ان قوانین کا علم حاصل کر کے اشیائے فطرت کو اپنے مصرف میں لائے۔ اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ جو لوگ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں گے لَهُمُ الْبُشْرٰى فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (۱۰/۶۴) ان کے لئے اسی دنیاوی زندگی میں شادابیوں اور سرفرازیوں کی خوشخبریاں ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ قوانین الٰہیہ کے خلاف زندگی بسر کریں گے۔ ان کے لئے خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا۔ اس دنیا کی زندگی میں ذلت و خواری ہے۔ اس خیال سے کہ کوئی اس "ذلت و خواری" کو "روحانی پستی" قرار دے کر لوگوں کو بہکا نہ دے۔ اس نے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیا کہ جن قوموں نے قوانین الٰہیہ سے سرتابی برتی فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (۱۶/۱۱۲)

بھوک خدا کا عذاب ہے

اللہ نے ان پر بھوک اور خوف کا عذاب طاری کر دیا۔ اور یہ عذاب یونہی نہیں آ گیا۔ بلکہ یہ ان کی روش زندگی، ان کے اعمالِ حیات کا لازمی نتیجہ تھا۔

مجھے امید ہے برادران! کہ ان تصریحات کی روشنی میں کسی کے دل میں یہ خیال باقی نہیں رہا ہوگا کہ قرآن کو بھلا معاشی معاملات سے کیا تعلق! لیکن اگر کسی کے دل میں اب بھی اس کی کوئی رمق یا دھندلا سا نقش باقی ہے تو اس کے لئے قرآن میں ایسی آیت بھی موجود ہے جس میں خود "معیشت" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ غور سے سنئے۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا.... (۲۰/۱۲۴) جو ہمارے قانون سے اعراض برتے گا۔ اس کی معیشت تنگ ہو جائے گی وہ روٹی کا محتاج ہو جائے گا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے کا لازمی نتیجہ معیشت کی کشادگی، عزت کی روٹی (رِزْقٌ كَرِيْمٌ) اور سامانِ زیست کی فراوانی ہے۔ اس کے برعکس بھوک اور خوف خدا کا عذاب ہے جو اس کے قانون سے اعراض برتنے اور پہلوتہی کرنے سے مسلط ہو جاتا ہے۔ لہٰذا یہ سمجھنا غلط ہے کہ دین کا تعلق محض انسان کی عاقبت سنوارنے سے ہے۔ اس دنیا سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ اور یہ خیال کرنا بھی غلط ہے کہ مفلسی اور ناداری، غریبی اور محتاجی قرب خداوندی کا ذریعہ ہے۔ جن باتوں کو خدا اپنا عذاب قرار دے وہ اس کے قرب کا ذریعہ کس طرح بن سکتی ہیں؟ اس کے قرب کا ذریعہ ایمان و اعمالِ صالحہ ہیں اور ایمان و اعمال صالحہ کے متعلق اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ.... (۲۴/۵۵) اللہ نے ان لوگوں سے وعدہ کر رکھا ہے جو اس کے قانون کی صداقت پر یقین محکم رکھیں اور اس کے متعین فرمودہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہوں کہ وہ انہیں اسی دنیا میں غلبہ و حکومت عطا کرے گا۔ جس طرح اس نے اس سے پہلے ان قوموں کو استخلاف عطا کیا جنہوں نے اس پروگرام کے مطابق زندگی

بسر کی۔ یہ برادران! خدا کا وعدہ ہے اور یہ ظاہر ہے کہ خدا کا کوئی وعدہ (معاذ اللہ) جھوٹا نہیں ہو سکتا۔ اس وعدہ کی صداقت پر قرآن نے تاریخی نوشتوں کو بطور شہادت پیش کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جس ایمان اور اعمال کا نتیجہ دنیا میں غلبہ و حکومت، تمکن و تسلط نہیں قرآن کی میزان میں نہ وہ ایمان ایمان ہے، نہ وہ اعمال اعمالِ صالحہ۔ پھر یہ بھی سمجھ لیجئے کہ یہ غلبہ و حکومت ایسا نہیں جو دیگر اقوامِ عالم کو بھی حاصل ہو جائے۔ بلکہ ایسا غلبہ و حکومت جس میں دنیا کی کوئی قوم ان کی برابری نہ کر سکے۔ اس لئے کہ قرآن کا فیصلہ ہے کہ وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۳/۱۳۹) اگر تم صاحبِ ایمان ہو گے تو تم تمام اقوامِ عالم سے بلند و برتر ہو گے وَلَنْ یَّجْعَلَ اللّٰہُ لِلْکٰفِرِیْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلًا (۴/۱۴۱) ایسا ہو نہیں سکتا کہ خدا اس صاحبِ ایمان قوم پر ایسی قوم کو غلبہ عطا کر دے جو صاحبِ ایمان نہ ہو۔ نوعِ انسانی کی امامت (LEADERSHIP) اس قوم کے حصہ میں آئے گی، جیسا کہ ان کے مؤسسِ اوّل حضرت ابراہیم سے کہا گیا تھا کہ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (۲/۱۲۴) میں تجھے نوعِ انسانی کا امام (لیڈر) بنانے والا ہوں۔ یہ سب کچھ قانونِ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا نتیجہ ہو گا۔ اس کے برعکس جو اس قانون سے گریز کی راہیں نکالے گا (وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِکْرِیْ) تو اسے علاوہ اختلاف اور قیادت و امامت کا ملنا تو ایک طرف، وہ روٹی تک کا محتاج ہو جائے گا۔ (فَاِنَّ لَہٗ مَعِیْشَۃً ضَنْکًا)

آپ نے غور فرما لیا برادران! کہ قرآن کو معیشت سے کتنا گہرا تعلق ہے؟

معاشی مسئلہ کی اہمیت

اب میں اس سوال کی طرف آتا ہوں کہ قرآن نے معاشی مسائل کا حل کیا بتایا ہے؟ اس سوال تک پہنچنے سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اگرچہ روٹی کا مسئلہ اس دن سے آدم کے ساتھ ہے جس دن اس نے اپنے ارضی مستقر پر آنکھ کھولی، لیکن ہمارے زمانہ میں اس نے اس قدر اہمیت حاصل کر لی کہ افراد اور اقوام دونوں اس کی وجہ سے پریشان ہیں۔ مارکس اور لینن کو جو شہرت حاصل ہوئی ہے۔ وہ بھی اسی عالمگیر پریشانی کی وجہ سے ہے اور بساطِ سیاست پر روس جن توجہات کا مرکز بن رہا ہے۔ وہ بھی اسی مسئلہ کی پیدا کردہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آج سیاست، حکومت، تہذیب، تمدن، ملی مسائل اور بین الاقوامی معاملات سب کی باگ ڈور معاشیات کے ہاتھ میں ہے۔ ہمارا یہ دعویٰ ہے (اور یہ دعوےٰ ایمان پر مبنی ہے) کہ قرآن نوعِ انسانی کے لئے ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ جس میں انسانی زندگی کی تمام مشکلات کا حل موجود ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس میں زندگی کے تمام مسائل کا حل موجود ہے تو اس مسئلہ کا حل بھی ضرور ہونا چاہیئے جس نے اس قدر اہمیت حاصل کر رکھی ہے۔ اور جس کا تعلق انسان کی طبعی موت و حیات سے ہے۔ آج دنیا دو بڑے بڑے بلاکوں میں بٹ رہی ہے۔ ایک طرف مغربی جمہوریتیں ہیں جو اس نظامِ سرمایہ داری کی وارث ہیں۔ جس نے نوعِ انسانی کو تباہی و بربادی کے جہنم کے کنارے پہنچا دیا ہے۔ دوسری طرف روس کا بلاک ہے جس کے انسانیت سوز استبداد کے ہاتھوں خود وہاں کے اربابِ حل و عقد بری طرح چیخ رہے ہیں ان دونوں جہنموں کے درمیان مظلوم و مقہور انسانیت بری طرح سہمی کھڑی ہے۔ آج اگر کوئی قوم روٹی کے مسئلہ کا ایسا حل بتا دے جو نوعِ انسانی کو ان دونوں جہنموں سے نکال کر سلامتی کی جنت کی طرف لے جائے تو یقین مانئے کہ اقوامِ عالم کی امامت بلا تامل اس کے حصہ میں آجائے گی یہ تھا وہ شدید احساس جس کی بنا پر میں نے اس مسئلہ کے حل کے لئے قرآن کے بابِ عالی پر دستک دی۔ اور یہ اس کی رحمتِ بے پایاں کا

تصدق تھا کہ اس نے اس نقیر بے نوا کو اپنے دروازے سے محروم نہیں لوٹایا۔ مجھے جو راہ نمائی قرآن سے حاصل ہوئی ہے میں اسے ایک مختصر قوم کے ارباب فکر و نظر کے سامنے پیش کر رہا ہوں، بایں امید کہ اگر وہ بھی قرآنی تدبر کے بعد مجھ سے متفق ہوں تو پھر ہم سب مل کر سوچیں کہ اس کی عملی تشکیل کی کیا صورت ہونی چاہیئے۔ میں نے اپنی قرآنی بصیرت کو نہ کبھی سہو و خطا سے مبرا خیال کیا ہے، نہ حرفِ آخر سمجھا ہے۔ اس فکر کے عام کرنے سے میرا مقصود یہ ہے کہ جو دیگر حضرات اپنی اپنی جگہ اس نہج پر غور و تدبر کر رہے ہوں وہ بھی اس کوشش میں میرے رفیق راہ بن جائیں، تاکہ ہم سب مل کر منزلِ مقصود تک پہنچ سکیں۔

غزل سرائیم و پیام آشنا گوئیم
بایں بہانہ دریں بزم محرمے جوئیم

رزق کی ذمہ داری

قرآن میں ہے کہ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا (۱۱/۶) روئے زمین پر کوئی چلنے والا ایسا نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمے نہ ہو۔ یہ ایک بہت بڑا اعلان ہے اور بڑا عظیم الوعدہ۔ اس سے ذرا سمٹ کر خالص انسانی دنیا کی طرف آیئے تو وہاں ارشاد ہے کہ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ (۶/۱۵۲) ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہاری اولاد کو بھی۔ اس سے ظاہر ہے کہ انسانوں کی اپنی اور ان کی اولاد کے رزق کی بہم رسانی خدا نے اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ صرف رزق (یعنی سامانِ زیست) ہی کی نہیں بلکہ اس نے اپنے آپ کو رب الناس کہا ہے۔ ربوبیت کے معنی ہیں کسی شے کو اس کے نقطۂ آغاز سے پرورش دیتے دیتے بتدریج اس کے نقطۂ تکمیل تک پہنچا دینا۔ لہٰذا ربّ الناس کا مفہوم یہ ہوا کہ ہر فرد انسانیہ کی صلاحیتوں کی مکمل نشو و نما کی ذمہ داری بھی خدا نے اپنے اوپر لے رکھی ہے۔ اس ذمہ داری کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ اس نے قرآن کی ابتداہی الحمد للہ ربّ العالمین کے اعلان سے کی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ہر قسم کی ستائش اللہ کے لئے ہے۔ اس لئے کہ وہ تمام اقوامِ عالم کی نشو و نما کا ذمہ دار ہے۔ اس کی حمد و ستائش اسی بنا پر ہے کہ وہ تمام افرادِ انسانیہ کی صلاحیتوں کو نشو و نما دینے کا ذمہ دار ہے۔

ایک طرف تو برادران! یہ عظیم اعلان ہے کہ ہر متنفس کے سامانِ زندگی اور اسباب و ذرائع نشو و نما کی ذمہ داری خدا پر ہے لیکن دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ (انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما تو خیر بڑی چیز ہے) دنیا میں کروڑوں انسان ایسے ہیں جنہیں پیٹ بھر کر کھانے کو نہیں ملتا۔ اور ایک ایک قحط میں لاکھوں جانیں محض روٹی نہ ملنے سے تلف ہو جاتی ہیں۔ خود اپنے ملک پاکستان کو دیکھیے۔ اس میں کتنے انسان ایسے ہیں جو راتوں کو بھوکے سوتے ہیں۔ اس سے لامحالہ ایک سوچنے والے کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کی یہ ذمہ داری کیسی ہے جس میں لاکھوں انسان بھوکے سوتے ہیں؟ آپ اس سوال سے آنکھیں بند کر کے گذر جائیں تو اور بات ہے۔ لیکن اگر آپ ایک سیکنڈ کے لئے رک کر اس پر غور کریں تو آپ کے سامنے ایک جیتا جاگتا سوال اٹھ کھڑا ہو جائے گا جو نہیں سکتا کہ آپ کے دل کو طلسمِ پیچ و تاب نہ بنا دے۔ میں عزیزانِ من! آپ سے گزارش کروں گا کہ آگے بڑھنے سے پیشتر آپ اس سوال کو اپنے دل میں دہرائیں اور سوچیں کہ اس کا جواب آپ کے پاس کیا ہے؟ آپ اس کا جواب مشکل سے دے سکیں گے لیکن قرآن اس کا جواب آسانی سے دیدیتا ہے اور یہی ہے وہ جواب جس پر اس کے معاشی نظام کی عمارت استوار ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جہاں

یعنی خارجی کائنات (باہر کی دنیا) کا تعلق ہے۔ خدا کی ذمہ داری اس کے قانون کی رو سے پوری ہو رہی ہے جس سے کسی شے کو مجالِ سرتابی نہیں۔ وَلِلّٰهِ يَسْجُدُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ (۱۶/۴۹) کائنات کی ہر شے قانونِ خداوندی کے سامنے سجدہ ریز ہے۔ اور یہ قانون ان کی نشو و نما کی تمام ضروریات کو پورا کئے چلا جاتا ہے۔

اس ذمہ داری کا مفہوم کیا ہے

يَسْأَلُهُ مَن فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ (۵۵/۲۹) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو شے ہے اپنی نشو و نما کے لئے اس کی محتاج ہے اور ان کی یہ احتیاج ایسی نہیں کہ ہمیشہ ایک ہی جیسی رہے بلکہ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ (۵۵/۲۹) ہر شے ہر آن میں ایک نیا پہلو بدلتی ہے اس لئے اس کی نشو و نما کے تقاضے بھی بدلتے رہتے ہیں۔ لیکن خدا کا قانونِ ربوبیت ان بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق ان کا سامانِ نشو و نما بہم پہنچائے چلا جاتا ہے۔ لیکن انسانوں کی دنیا میں حالت جداگانہ ہے۔ انسان کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو خدا کے قانونِ ربوبیت کو اختیار کرے اور چاہے تو اس سے سرتابی اختیار کرکے اس کی جگہ اپنا نظام رائج کرے۔ جب انسان اپنا نظام رائج کر لیتا ہے تو وہ پھر خدا کی ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو باہر لے آتا ہے۔ جب وہ اپنی زندگی اس کے قانون کے تابع لے آتا ہے تو اس کی ایک ایک ذمہ داری نہایت حسن کارانہ انداز سے پوری ہوتی چلی جاتی ہے۔ خدا براہِ راست انسانوں کو رزق نہیں پہنچاتا بلکہ اس نظام کی وساطت سے پہنچاتا ہے جو اس کے قانون کے مطابق قائم ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو قرآن نے سورۂ یٰسین کی ایک آیتِ جلیلہ میں جامع طور پر بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے کہ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ قَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لِلَّذِينَ آمَنُوا أَنُطْعِمُ مَن لَّوْ يَشَاءُ اللّٰهُ أَطْعَمَهُ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا فِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (۳۶/۴۷) جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے تمہیں سامانِ زندگی دیا ہے اسے (دوسروں کی پرورش کے لئے) کھلا رکھو۔ تو وہ لوگ جو خدا کے قانونِ ربوبیت پر ایمان نہیں رکھتے ان لوگوں سے کہتے ہیں جو اس پر ایمان رکھتے ہیں کہ کیا ہم اس شخص کے کھانے کا انتظام کریں جسے اگر اللہ چاہتا تو اپنے قانونِ مشیت کے مطابق خود ہی کھانا کھلا دیتا (ان سے کہو کہ) تم ایسا سمجھنے اور کہنے میں کھلی ہوئی گمراہی میں ہو۔ خدا محتاج انسانوں کے کھانے کا انتظام از خود نہیں کیا کرتا۔ یہ انتظام اس نظام کی رو سے ہوتا ہے۔ جس میں قانونِ خداوندی کے مطابق رزق کو نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے عام کر دیا جاتا ہے۔ اسے قرآنی اصطلاح میں انفاق فی سبیل اللہ کہتے ہیں۔

نظام کے ہاتھوں

اب سوال یہ ہے کہ یہ نظام قائم کس طرح سے ہوتا ہے؟

قرآن کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ انسان صرف اس کے طبعی جسم کا نام نہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور چیز ہے جسے انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) یا نفس (SELF) یا انا (I) یا ایغو کہتے ہیں۔ انسانی جسم طبعی قوانین کے مطابق زندہ رہتا ہے۔ اور انہی قوانین کے مطابق اس پر موت طاری ہو جاتی ہے لیکن اگر انسانی ذات کی مناسب نشو و نما ہو جائے تو وہ طبعی موت سے مرتی نہیں بلکہ حیاتِ جاوید حاصل کر سکتی ہے۔ اس اعتبار سے انسان کی زندگی ایک جوئے رواں ہے جو مسلسل آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ انسانی ذات کی نشو و نما، انسانی زندگی کا مقصود ہے اور قرآن ایسا پروگرام عطا کرتا ہے جس سے اس کی نشو و نما ہوتی چلی جاتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کے جسم کی پرورش اس چیز سے ہوتی ہے جسے انسان خود کھائے یا خود استعمال کرے۔ لیکن انسانی ذات کی پرورش اس چیز سے ہوتی

ہے جسے وہ دوسروں کی نشوونما کے لئے دے۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ انسانی جسم کی پرورش "لینے" میں ہوتی ہے اور انسانی ذات کی پرورش "دینے" میں۔ جو لوگ اس حقیقت پر یقین نہیں رکھتے۔ ان کے نزدیک انسانی زندگی کا مقصود صرف جسم کی پرورش ہوتا ہے۔ اس کے لئے ہر فرد کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ جتنا کچھ سمیٹا جا سکے اپنے (اور اپنی اولاد کے لئے) سمیٹ کر رکھ لے۔ اسی کو نظامِ سرمایہ داری کہتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ زندگی کے تسلسل پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کی نشوونما کی فکر کرتے ہیں جس کا طریق یہ ہے کہ انسان اپنی پوری پوری محنت سے سب کچھ حاصل کرے لیکن اس میں سے اپنے لئے صرف اتنا رکھے جس سے اس کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ اور باقی سب کچھ دوسروں کی نشوونما کے لئے کھلا چھوڑ دے۔ اسے انفاق فی سبیل اللہ کہتے ہیں۔ جو لوگ اس اصولِ حیات پر یقین رکھتے ہیں۔ انھیں جماعتِ مومنین کہتے ہیں۔ یہ جماعت ایسا نظام قائم کرتی ہے جس میں ہر فرد، فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنے کے لئے مصروفِ جد و جہد رہتا ہے۔ لیکن اپنی سعی و عمل کے ماحصل کو اس نظام کے سپرد کر دیتا ہے جسے یہ نظام نوعِ انسانی کی ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کے لئے صرف کرتا ہے۔ قرآن نے افراد اور نظام کے اس تعلق کو باہمی معاہدہ سے تعبیر کیا ہے اور یہی معاہدہ درحقیقت اس نظام کی بنیاد ہے۔ آپ دیکھئے کہ اس نے اس حقیقت کو کس قدر مختصر

اللہ سے معاملہ

لیکن جامع الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (۹/۱۱۱) عام الفاظ میں اس کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ جماعتِ مومنین سے ان کے نفوس اور اموال خرید لیتا ہے اور اس کے معاوضہ میں انھیں جنت عطا کر دیتا ہے۔ اسمیں تین چار الفاظ تشریح طلب ہیں اور جب تک ان کی قرآنی تشریح سامنے نہیں آتی اس آیت کا مطلب واضح نہیں ہوتا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں انسانی معاشرہ میں خدا کا نظام، خود انسانوں کے ہاتھوں سے متشکل ہوتا ہے۔ جب ایسا نظام قائم ہو جاتا ہے تو جو کام اس نظام کے ہاتھوں سے سرزد ہوتے ہیں انھیں خدا خود اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ مثلاً جنگِ بدر میں نبی اکرمؐ اپنے رفقاء کی جماعت کے ساتھ، مخالفین سے مصروفِ نبرد آزما ہیں۔ میدانِ کارزار میں تلواریں چلتی ہیں۔ تیر اندازی ہوتی ہے۔ بظاہر یہ سب کچھ انسانوں کے ہاتھوں سے ہو رہا تھا۔ لیکن چونکہ یہ اس نظام کے ماتحت ہو رہا تھا جو قوانینِ الٰہیہ کے مطابق قائم ہوا تھا۔ اس لئے خدا کا ارشاد ہے کہ فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ (۸/۱۷) تم مخالفین کو قتل نہیں کر رہے تھے خود خدا انھیں قتل کر رہا تھا۔ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى (۸/۱۷) تم ان کی طرف تیر نہیں پھینک رہے تھے۔ خدا تیر پھینک رہا تھا۔ قرآن کریم سے اس قسم کی متعدد مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں جن میں لفظ اللہ کا استعمال کیا گیا ہے لیکن اس سے مراد وہ نظام ہے جو اس کے قانون کے مطابق متشکل ہوتا ہے لہٰذا اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ میں بھی اللہ سے مراد وہ نظام ہے جو اس کے قانون (قرآن کریم) کے مطابق قائم ہوتا ہے۔ اس لئے آیت کا مطلب یہ ہے کہ افرادِ معاشرہ (مومنین) اپنے نفوس اور اموال اس نظام کے سپرد کر دیتے ہیں جو خدا کی صفت ربّ العالمینی کو عام کرنے کے لئے قائم ہوتا ہے۔ "نفوس" میں انسان کی وہ تمام صلاحیتیں آ جاتی ہیں۔ جو اسے خدا کی طرف سے جاہزد معاوضہ از خود عطا ہوتی ہیں۔ اور "اموال" میں وہ سب کچھ آ جاتا ہے جسے انسان اپنی سعی و کاوش سے حاصل کرتا ہے۔

یہ تو ہوا برادران! اس معاہدہ کا ایک حصہ۔ یعنی مومنین اپنے وہبی اور اکتسابی ماحصلِ زندگی کو اس نظام کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اب لیجئے اس معاہدہ کا دوسرا حصہ۔ وہ حصہ یہ ہے کہ اس کے بدلے میں یہ نظام انھیں جنت عطا کر دیتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ جنت سے کیا مراد ہے؟

جنت ارضی کا مفہوم

اس مقام پر عزیزانِ من یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس زندگی کے بعد کی زندگی میں جنت اور جہنم کی جو کیفیت ہوگی وہ اپنی جگہ پر برحق ہے۔ اور اس پر ہمارا ایمان۔ لیکن قرآن کی رو سے جنت اور جہنم صرف اسی زندگی سے مخصوص نہیں۔ وہ انسان کی موجودہ زندگی میں بھی جنت اور جہنم کا ذکر کرتا ہے۔ اس دنیا کی جنت کے متعلق وہ آدم سے کہتا ہے کہ اس کی کم از کم خصوصیت یہ ہے کہ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَلَا تَعْرٰى. وَاَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى (۲۰ / ۱۱۸ - ۱۱۹) اس میں نہ تجھے بھوک کا اندیشہ ہوگا نہ لباس سے محروم رہنے کا ڈر۔ نہ اس میں پیاس ستائے نہ سورج کی حرارت۔ یعنی اس میں خوراک، لباس اور مکان کے متعلق کسی قسم کی تشویش اور پریشانی نہیں ہوگی۔ اس میں سامانِ رزق اس افراط سے ہوگا کہ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا (۲/۳۵) انسان جہاں سے جس کا جی چاہے سیر ہو کر کھائے پیے۔ آپ نے غور فرمایا برادران! کہ اس معاہدہ کی رو سے بات کیا بنی؟ بات یہ بنی کہ افرادِ معاشرہ اپنی محنت کے ماحصل کو اس نظام کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اور وہ نظام تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی (BASIC NECESSITIES OF LIFE) کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے اور اس طرح خدا کی وہ ذمہ داری عملاً پوری ہوتی چلی جاتی ہے جس کی رو سے اس نے کہا تھا کہ "زمین پر ہر چلنے والے کے رزق کی ذمہ داری ہم پر ہے"۔ اور ہم تمہیں بھی سامانِ زیست دیتے ہیں اور تمہاری اولاد کو بھی۔ غور کیجئے برادران! اگر کسی معاشرہ میں ہر فردِ معاشرہ کو اس کی ضمانت (SECURITY) حاصل ہو جائے کہ وہ اور اس کی اولاد کسی حالت میں بھی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہ سکتے۔ اور یہ ضمانت ایسی محکم ہو کہ لَا انْفِصَامَ لَهَا. وہ کبھی ٹوٹے نہیں۔ کبھی دغا نہ دے۔ کبھی عہد شکنی نہ کرے۔ تو اس معاشرے میں انسان کی زندگی کس قدر جنتی زندگی ہوگی۔؟ اور پھر یہ بھی سوچئے کہ جب لوگوں کو اس کا یقین ہو جائے کہ وہ اور ان کی اولاد ضروریاتِ زندگی سے کبھی محروم نہیں رہیں گے۔ تو انہیں مال و دولت جمع کرنے کی ضرورت کیا ہوگی۔ اور وہ بددیانتی اور بے ایمانی کیوں کریں گے؟ انسان سمیٹتا اور جمع اس لئے کرتا ہے کہ اسے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اگر کل کو کوئی ناگہانی افتاد آپڑی تو میں اور میرے بچے بھوکے مر جائیں گے۔ کوئی ہمیں پوچھنے کا نہیں۔ وہ اس خطرے سے محفوظ رہنے کے لئے سمیٹتا ہے اور زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کی فکر کرتا ہے۔ اور اس میں پھر جائز و ناجائز کی تمیز بھی باقی نہیں رہتی۔ غور کیجئے کہ جس معاشرے میں ہر فرد کی یہ کوشش ہو کہ وہ زیادہ سے زیادہ اپنے لئے سمیٹ لے! اس معاشرے میں زندگی کس قدر جہنم کی زندگی ہوگی۔ اس جہنم کی زندگی جس میں آج ہم سب بری طرح جل رہے ہیں۔ اور اس سے نکلنے کی کوئی صورت کسی کی سمجھ میں نہیں آتی وَمَا هُمْ بِخَارِجِيْنَ مِنَ النَّارِ (۲/۱۶۷)

اس سے برادران! یہ حقیقت بھی سمجھ میں آجائے گی کہ جس معاشرہ میں، افرادِ معاشرہ اپنی محنت کی کمائی اور استعداد کے ماحصل کو اپنی ملکیت نہ سمجھیں بلکہ اپنے نظام کے ہاتھوں رکھی ہوئی متاع سمجھیں اس میں وسائلِ پیداوار

وسائل پیداوار

یا ذرائع رزق کے ذاتی ملکیت میں رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رزق (سامانِ زیست) کے وسائل کی شکلیں مختلف ہیں لیکن اگر آپ انہیں سمٹا کر دیکھتے جائیں گے۔ تو آپ دیکھیں گے کہ اصولی طور پر رزق کا ذریعہ ایک ہی رہ جاتا ہے جسے زمین کہتے ہیں۔ اسی لئے قرآن نے ذرائع رزق کو ارض کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ اور ارض کے متعلق واضح الفاظ میں کہہ دیا ہے کہ وہ اس لئے پیدا کی گئی ہے کہ [illegible] انسان سے ایک وقت معینہ تک فائدہ اٹھائے (مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ) اور یہ تمام ضرورت مندوں

کے لئے یکساں طور پر کھلی رہے سَوَآءً لِلسَّآئِلِیۡنَ (۴۱/۱۰)

ان تصریحات سے آپنے دیکھ لیا ہوگا۔ کہ قرآن معاشی مشکلات کے حل کے لئے ایک نظام تجویز کرتا ہے۔ یہ نظام

(۱) ان لوگوں کے ہاتھوں سے متشکل ہوتا ہے جو اس حقیقتِ کبریٰ پر یقین محکم رکھتے ہیں کہ زندگی صرف انسانی جسم کا نام نہیں، حیات کا سلسلہ جسم کی موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے۔ یہ سلسلہ انسانی ذات سے متعلق ہوتا ہے۔ اور انسانی ذات کی نشوونما کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنی متاعِ جان و مال کو نوعِ انسانی کی پرورش (ربوبیت) کے لئے عام کردے۔

(۲) یہ نظام تمام افرادِ معاشرہ کی ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے اور ان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما کا سامان مہیا کرنے کی ذمہ داری لیتا ہے۔

(۳) اور اس میں ذرائعِ رزق افراد کی ملکیت میں رہنے کے بجائے اس نظام کی تحویل میں رہتے ہیں۔ جو رزق کو قوانینِ خداوندی کے مطابق تقسیم کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

کمیونزم اور اسلام میں یہ کچھ کہہ رہا ہوں اور میری نگاہیں ان دلوں کو بھانپ رہی ہیں۔ جن میں یہ خیالات اٹھ رہے ہیں کہ یہ تو وہی بات ہے جو کمیونزم کہتی ہے۔ اس لحاظ سے کمیونزم اور اسلام ایک ہی ہیں۔ ان حضرات سے میری گذارش ہے کہ وہ اس نتیجہ تک پہونچنے میں جلد بازی سے کام نہ لیں۔ ہماری بڑی مصیبت یہ ہے کہ ہم بہت جلد باز واقع ہوئے ہیں۔ کسی بات میں ذرا سی مشابہت دیکھی اور ہم نے جھٹ سے کہہ دیا کہ یہ عین اسلام ہے۔ اقوامِ مغرب نے اپنے ہاں جمہوری نظام رائج کیا اور ہم نے شور مچا دیا کہ اسلام جمہوریت کا مذہب ہے کیونکہ قرآن میں لکھا ہے کہ وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ (ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے) حالانکہ مغربی جمہوریت اور اسلام کی مشاورت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسی طرح جب ہم نے دیکھا کہ کمیونزم بھی ذاتی ملکیت کی نفی کرتی ہے، اور قرآن بھی ذرائعِ پیداوار پر ذاتی ملکیت تسلیم نہیں کرتا۔ تو ہم نے کہنا شروع کر دیا کہ اسلام اور کمیونزم ایک ہی ہیں۔ حالانکہ (ایک ہونا تو کجا) یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں۔ اگر اسی قسم کی جزوی مشابہتوں سے ہم نے اسلام کو دیگر نظام ہائے زندگی سے ملانا شروع کر دیا تو کچھ عجب نہیں کہ کل کو کہہ دیا جائے کہ بھارت کا سیکولر نظام بھی عین اسلام ہے کیونکہ انہوں نے شراب کو ممنوع قرار دیا ہے اور اسلام بھی اسے ناجائز ٹھہراتا ہے۔ یا آریہ دھرم اور اسلام ایک ہی ہیں کیونکہ آریہ سماجی بھی بت پرستی کو برا سمجھتے ہیں اور اسلام بھی اسے شرک قرار دیتا ہے میرا مطلب یہ ہے کہ آپ اتنی سی مشابہت سے اسلام اور کمیونزم کو ایک نہ قرار دیجئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی ازم (ISM) ضابطۂ زندگی کی حیثیت سے اسلام کے خلاف ابھری ہے تو وہ کمیونزم ہے۔ کمیونزم کا فلسفۂ زندگی اور ضابطۂ حیات کیا ہے۔ یہ ایک طویل بحث ہے جسے ضمنی طور پر بیان نہیں کیا جا سکتا۔ اگر آپ اس کی تفاصیل معلوم کرنا چاہتے ہیں تو میری کتاب "نظامِ ربوبیت" یا تازہ تالیف "انسان نے کیا سوچا؟" ملاحظہ فرمایئے۔ اس وقت مختصر الفاظ میں یہ سمجھئے کہ کمیونزم کا فلسفہ یہ ہے کہ یہ کائنات یونہی کسی طرح از خود وجود میں آگئی۔ اس کا نہ کوئی

کمیونزم کا فلسفہ خالق ہے۔ نہ ہی اس کی تخلیق کا کوئی مقصد۔ اسی طرح زندگی (LIFE) اور شعور (CONSCIOUSNESS)

بھی مادے سے خود بخود پیدا ہو گئے۔ اس لئے انسانی زندگی بھی کسی پلان (PLAN) کے مطابق وجود میں نہیں آئی۔ زندگی اس طبعی زندگی کا نام ہے اور جسم کے انتشار (DISINTEGRATION) کے بعد انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ دنیا میں جائز و ناجائز اور حق و باطل کے لئے کوئی خارجی معیار مقرر نہیں۔ اس لئے مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کا تصور ذہن انسانی کا خود تراشیدہ ہے۔ دنیا میں ایک نظام قائم ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد اس نظام میں سے اس کی ضد ایک دوسرا نظام ابھرتا ہے جو پہلے نظام کی جگہ لے لیتا ہے۔ یہ سلسلہ تعمیر و تخریب از خود جاری رہتا ہے۔ اس کی قوت محرکہ تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) ہے۔ دور حاضرہ سے پیشتر سرمایہ داری کا نظام قائم تھا۔ تاریخی وجوب کا تقاضا تھا کہ اس میں سے اشتراکی نظام پیدا ہو۔ لہٰذا اب اشتراکی نظام کا دور ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ نظام بھی ختم ہو جائے گا۔ اور اس میں سے اس کی ضد دوسرا نظام ابھر آئیگا یہ ہے برادران! مختصر الفاظ میں کمیونزم کا وہ فلسفہ جسے مارکس نے پیش کیا اور جس پر لینن نے روس میں عمل کر کے دکھایا۔ آپ اس فلسفۂ زندگی کو دیکھئے۔ اور اس کے بعد اس تصور حیات پر غور کیجئے جسے قرآن پیش کرتا ہے اور جس کا اجمالی سا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں۔ اور اس کے بعد خود ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا یہ دونوں تصورات ایک دوسرے کے مطابق ہیں یا ایک دوسرے کی ضد! آپ شاید یہ کہدیں کہ جہاں تک کمیونزم کے معاشی پروگرام کا تعلق ہے۔ وہ تو بہر حال قرآنی نظام سے ملتا جلتا ہے۔ لیکن یہ بھی سطح بینی اور فریب خوردگی ہے پروفیسر (HAWTRAY) نے کہا ہے کہ

> جو چیز ایک معاشی نظام کو دوسرے معاشی نظام سے متمیز کرتی ہے یہ ہے کہ اس نظام میں وہ جذبۂ محرکہ کیا ہے جو لوگوں کو کام کرنے پر آمادہ کر رہا ہے۔

جذبۂ محرکہ

آپ دیکھیں گے کہ کمیونزم کے پاس کوئی جذبۂ محرکہ ایسا نہیں جو کسی فرد کو اس پر آمادہ کر دے کہ وہ جان مار کر محنت کرے اور پھر اپنی محنت کا ماحصل بطیب خاطر دوسروں کو دیدے۔ اشتراکیت کے علمبرداروں نے روس میں کیا کیا؟ انہوں نے وہاں کے مفلوک الحال مزدوروں اور نادار و محروم غریبوں کو یہ کہہ کر ابھارا کہ دیکھو! یہ بڑے بڑے سرمایہ دار کس طرح تمہارا خون چوس رہے ہیں تم اٹھو اور ان کے املاک و دولت کو ان سے چھین لو۔ یعنی انہوں نے ان کے دل میں نفرت اور انتقام کے جذبات کو مشتعل کیا اور اس طرح انقلاب برپا کیا۔ اس کے بعد کیا ہوا اس پر روس کی تاریخ شاہد ہے۔ ظاہر ہے کہ نفرت اور انتقام کے جذبات زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتے۔ جب وہ سرمایہ دار طبقہ ختم ہو گیا جس کے خلاف نفرت اور انتقام کے جذبات مشتعل کئے گئے تھے تو لوگوں میں کوئی جذبہ باقی نہ رہا جو انہیں دوسروں کی خاطر کام کرنے پر آمادہ کرے۔ اس کے لئے روس کے ارباب حل و عقد کو استبداد سے کام لینا پڑا۔ اس قسم کے استبداد سے کام لینا پڑا جس سے عوام تو ایک طرف وہاں کے لیڈر بھی چلا اٹھے۔ یہ جو آجکل اسٹالن کے جور و ستم کے واقعات منظر عام پر آ رہے ہیں۔ اس میں اسٹالن کا ذاتی طور پر کوئی قصور نہ تھا۔ یہ اس نظام کا فطری نتیجہ تھا۔ جس کی بنیاد نفرت اور انتقام کے علاوہ کسی تعمیری جذبہ پر نہیں تھی۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کا اعتراف لینن نے ان الفاظ میں کیا تھا کہ

> انقلاب ایک ایسا عمل ہے جس کی رو سے آبادی کا ایک حصہ دوسرے حصہ پر اپنا اختیار و تسلط

قوت داستبداد نوکِ شمشیر، گولیوں کی بوچھاڑ اور آتشیں گولوں کے دھماکوں سے زبردستی کراتا ہے۔

مکر و فریب

نہ صرف جور و استبداد سے بلکہ مکر و فریب سے بھی (GOLLANCZ) اپنی کتاب (OUR THREATENED VALUES) میں لکھتا ہے کہ مشہور اشتراکی لیڈر (DR. LUCKNZ) سے پوچھا گیا کہ کیا اشتراکی جماعت کے لیڈروں کے لئے جائز ہے کہ وہ اپنی جماعت کے افراد سے بھی کذب اور فریب دہی سے کام لیں؟ اس نے جواب دیا کہ

> اشتراکی اخلاق کی رُو سے یہ فریضہ سب سے اہم ہے کہ اسے تسلیم کیا جائے کہ عند الضرورت بددیانتی اور بے ایمانی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ یہ سب سے بڑی قربانی تھی جس کا ہم سے انقلاب نے مطالبہ کیا تھا۔

آپ کو اس جواب پر شاید تعجب ہو لیکن اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں جس ضابطۂ زندگی میں مستقل اقدار کو تسلیم نہ کیا جاتا ہو اس میں ہر حربہ جس سے مقصد حاصل ہوتا ہو جائز اور بلکہ ضروری قرار پا جاتا ہے۔ اور خدا پر ایمان کے بغیر مستقل اقدار کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

آپ نے غور فرمایا حضرات! کہ کمیونزم کس طرح اس جذبۂ محرکہ سے محروم ہے جو انسان کو دوسروں کی خاطر کام کرنے پر بطیب خاطر آمادہ کر دے۔ اس کے برعکس، جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، قرآن اپنے نظامِ ربوبیت کی بنیاد ایک ایسی ٹھوس حقیقت پر رکھتا ہے جس میں ہر فرد دوسروں کی نشو و نما کے لئے اس لئے مضطرب و بیقرار رہتا ہے کہ وہ اس پر ایمان رکھتا ہے کہ اس سے خود اس کی اپنی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے مَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ (۳۵/۱۸) جو دوسروں کے لئے سامان نشو و نما مہیا کرتا ہے۔ وہ خود درحقیقت اپنی ذات کی نشو و نما کرتا ہے۔ اس کے برعکس مَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ (۴۷/۳۸) جو دوسروں کو سامانِ زیست سے محروم رکھتا ہے وہ درحقیقت خود اپنی ذات کو نشو و نما سے محروم رکھتا ہے۔ یہ ہے برادران! وہ ایمان جس سے ایسی قوم پیدا ہو جاتی ہے جس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ يُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹) وہ ہمیشہ دوسروں کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں خواہ انہیں خود تنگی اور مشکل سے گذارہ کیوں نہ کرنا پڑے۔ یہی ہے وہ قوم جس سے اس نظامِ خداوندی کا قیام عمل میں آتا ہے۔ جو دنیا کو علیٰ وجہ البصیرت دکھا دیتا ہے کہ "خدا ہر متنفس کو کس طرح رزق دیتا ہے" اور وہ جنتِ ارضی کس طرح سامنے آ جاتی ہے۔ جس میں کوئی فرد اپنی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں رہتا۔ اور ہر فرزندِ آدم کی مضمر صلاحیتیں کامل طور پر نشو و نما پا لیتی ہیں۔ اسی نظام کا نام اسلامی نظام اور اس کے آئین کا نام اسلامی آئین ہے —— اگر بایں رسیدی تمام بولہبی است۔

قرآن اسی ضمن میں یہ بھی کہتا ہے کہ اس نظام کی مخالفت سرمایہ دار، مفاد پرست طبقہ کی طرف سے ہوگی۔ اور سخت مخالفت ہوگی لیکن انہیں آخر الامر شکست مل کر رہے گی۔ اس باب میں قرآن نے ایک ایسی حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ نگہِ بصیرت جوں جوں اس پر غور کرتی ہے، وجد و مسرت سے رقص میں آ جاتی ہے۔

سرمایہ داری اور پیشوائیت

وہ کہتا ہے کہ اس نظام کی مخالفت صرف سرمایہ دار طبقہ ہی کی طرف سے نہیں ہوگی بلکہ انسانوں کے خود ساختہ مذہب کے راہ نما (PRIESTS) بھی اس کے مخالف ہوں گے اس لئے کہ یہ طبقہ بھی مترفین میں شامل ہے۔ یعنی ان میں جو دوسروں کی کمائی پر

چلتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کا ہر رسول اسی پیغام کو لے کر آیا ہے لیکن سرداران قوم اور پیشوایانِ مذہب نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی۔ ارباب شریعت یہ کہہ کر عوام کے جذبات کو مشتعل کرتے کہ یہ شخص تمہیں اس روش زندگی سے برگشتہ کرنا چاہتا ہے جس پر تمہارے اسلاف چلتے تھے۔ اس لئے تم اس کی بات بالکل نہ ماننا۔ اس کے ساتھ ہی قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ مفاد پرست طبقہ اس پیغام کی مخالفت میں براہ راست سامنے نہیں آتا بلکہ ارباب مذہب کو آگے بڑھاتا ہے اور خود ان کی حمایت کرتا رہتا ہے۔ داستان بنی اسرائیل میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ فرعون کی طرف گئے اور اس سے کہا کہ خدا کے بندوں کو اپنی غلامی سے آزاد کر دے تو اس نے دو چار باتوں کے بعد اس خطرہ کا اندازہ کرلیا۔ جو اس پیغام میں پوشیدہ تھا۔ اس کے لئے اس نے اپنے مہامنتری (HEAD PRIEST) ہامان کو بلایا اور کہا کہ وہ اپنے لاؤ لشکر کو تیار کر کے لائے۔ اور حضرت موسیٰ کا مقابلہ کرے۔ یعنی وہ خود تو پیچھے ہٹ گیا۔ اور ضرب کلیمی کے مقابلے کے لئے پیشوائیت کو سامنے لایا۔ مفاد پرست گروہ ہمیشہ سے یہی کرتا چلا آیا ہے۔ اور آج بھی یہی کچھ کر رہا ہے۔ ملوکیت اور برہمنیت کا یہی وہ گٹھ جوڑ ہے جو انسانیت کے لئے تباہی کا موجب بنتا چلا آرہا ہے۔ برہمن، راجہ کو ایشور کا اوتار بتاتا ہے۔ اور راجہ برہمن کی رکھشا (حفاظت) کو اپنا دھرم سمجھتا ہے۔ قیصر پوپ کے لئے جاگیریں وقف کرتا ہے۔ اور پوپ، قیصر کے حقوقِ الوہیت (DIVINE RIGHTS) کی سندیں تراشتا ہے۔ مقصد دونوں کا یہ ہوتا ہے کہ غریبوں اور ناداروں کو جہالت آمیز افیون پلا کر مدہوش رکھا جائے۔ اور ان کی گاڑھے پسینے کی کمائی پر عیش اڑائے جائیں۔ آپ دیکھئے قرآن کریم کس طرح ان دونوں گروہوں کا ذکر ایک ہی سانس میں کرتا ہے۔ سورہ توبہ میں ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَیَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَیَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ۔ اے افرادِ جماعتِ مومنین! تم نے اس حقیقت کو اچھی طرح سے یاد رکھنا کہ ارباب شریعت اور ارکان طریقت کی اکثریت کا یہ عالم ہے کہ وہ بغیر کسی تعمیری کام کرنے کے عوام کی کمائی مفت میں کھا جاتے ہیں۔ اور ہر وقت اس قسم کے حیلے تلاش کرتے رہتے ہیں۔ جس سے لوگ اس راستہ کی طرف نہ جا سکیں جو خدا نے ان کے لئے متعین کیا ہے۔ یہ اس آیت کا پہلا حصہ ہے اس کے بعد ہے وَالَّذِیْنَ یَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (۹/۳۴) اور یہ سرمایہ دار گروہ جن کی حالت یہ ہے کہ وہ مال و دولت کے انبار در انبار سمیٹ کر جمع کرتے رہتے ہیں۔ اور اسے نوعِ انسانی کی پرورش کے لئے کھلا نہیں رکھتے۔ (اے رسول) تم ان سے کہہ دو کہ تمہاری اس روش کا نتیجہ سوائے دردانگیز تباہی کے اور کچھ نہیں ہوگا۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن نے کس جزم و یقین سے کہا ہے کہ نظامِ سرمایہ داری کا انجام دردانگیز تباہی کے سوا کچھ نہیں۔ خواہ مذہبی پیشوائیت اس کے تحفظ کے لئے کتنے ہی تعویذ کیوں نہ لکھے۔ قرآن نے اس حقیقت کو مختلف مقامات پر اس قدر واضح الفاظ میں دہرایا ہے کہ اس انقلاب کے واقع ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ تو ایک طرف ابہام تک بھی باقی نہیں رہتا۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کا کائناتی قانون خود اس انقلاب کو بروئے کار لانے میں سرگرم عمل ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ تم دیکھتے نہیں کہ ہم کس طرح زمین کو ان بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھوں سے سمٹا کر کم کرتے چلے جا رہے ہیں!! اس کے ساتھ ہی اس نے کہا ہے کہ کائناتی قانون کے ذریعے انقلاب بڑے طول طویل عرصہ میں جا کر ظہور پذیر ہوا کرتا ہے۔ اور خدا کا ایک ایک دن تمہارے حساب و شمار کے مطابق ہزار ہزار اور پچاس پچاس ہزار

سال کا ہوتا ہے: اس لئے اگر تم چاہتے ہو کہ یہ انقلاب جلد رونما ہو جائے تو تم اس کے لئے کوشش کرو اور کاملاً قانون کے رفیق و معاون بن جاؤ۔ پھر یہ انقلاب تمہارے "مہینوں کی مدت" میں تمہارے سامنے آجائے گا اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰہَ یَنۡصُرۡکُمۡ (۴۷/۷) محمد رسول اللہ والذین معہٗ نے بھی یہی کیا تھا۔ جس کا نتیجہ چند دنوں کے اندر دنیا کے سامنے آگیا تھا۔ جو معاشرہ حضورؐ نے قائم فرمایا تھا۔ اس میں نہ سرمایہ داری کا نام و نشان تھا، نہ مذہبی پیشوائیت کا کوئی پتہ سراغ۔ لیکن جب حضورؐ کی وساطت سے ملے ہوئے دین

ہمارا موجودہ مذہب

کی جگہ اس مذہب نے لے لی جو ہمارے دورِ ملوکیت میں وضع ہوا تھا۔ تو اس میں سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت دونوں "عین دین" بن گئے۔ یہی وہ انسانوں کا خود ساختہ مذہب ہے جو اس وقت تک ہم میں رائج ہے۔ چنانچہ آج حالت یہ ہے کہ غیر مسلم دنیا اپنے عقلی تجربات کی بنا پر سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت سے کنارہ کشی اختیار کئے چلی جا رہی ہے لیکن مسلمانوں کے ممالک انہیں اپنے سینے سے چمٹائے ہوئے ہیں۔ اور اگر کہیں سے اس کے خلاف آواز اٹھتی ہے تو مذہبی راہ نما اپنی پوری قوتوں سے مفاد پرستی کے تحفظ کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور عوام کے جذبات کو اسی پرانے حربہ سے مشتعل کر دیتے ہیں کہ مَا ھٰذَاۤ اِلَّا رَجُلٌ یُّرِیۡدُ اَنۡ یَّصُدَّکُمۡ عَمَّا کَانَ یَعۡبُدُ اٰبَآؤُکُمۡ (۳۴/۴۳) یہ شخص تمہیں تمہارے اسلاف کے طریقے سے ورغلا کر کسی اور طرف لے جانا چاہتا ہے۔ لیکن برادران! ان کے اس قسم کے حربوں سے یہ انقلاب خداوندی رک نہیں سکتا۔ وَاِنَّ السَّاعَۃَ اٰتِیَۃٌ لَّا رَیۡبَ فِیۡہَا (۲۲/۷) یہ انقلاب یقیناً آکر رہے گا۔ اس میں کسی قسم کا کوئی شک و شبہ نہیں۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ جہاں معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

مقصدِ پیش نظر

جی یہ چاہتا ہے برادران! کہ یہ قرآنی انقلاب اس قوم کے ہاتھوں سے رونما ہو جو خدا کی اس انقلاب آفریں کتاب پر ایمان رکھنے کی دعویدار ہے۔ اور اس کی عملی تجربہ گاہ پاکستان کی سرزمین بنے جسے ہم نے خدا کے قانون کو نافذ کرنے کے لئے حاصل کیا ہے۔ میری یہی کوشش ہے اور اس کے لئے میں اس قرآنی پیغام کو عام کرنے کے لئے جدوجہد کر رہا ہوں۔ میری استدعا یہ ہے کہ آپ میں سے جو خود قرآن پر غور و فکر کے بعد مجھ سے متفق ہوں، وہ اس قرآنی فکر کو عام کرنے کے لئے میرا ساتھ دیں۔ یا جس طریقے سے وہ مناسب سمجھیں اسے عام کریں۔ چہ عجب کہ اس طرح یہ سرزمین اپنے پرورش دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔ اور امامت امم کا جو وعدہ خدا نے کیا تھا وہ ملت پاکستانیہ کے حق میں پورا ہو جائے۔ لیکن اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں ہم کمیونزم کے اس سیلابِ عظیم کی زد میں نہ آجائیں۔ جس میں انسانیت کی تمام قدریں خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتی ہیں۔ یٰلَیۡتَنِیۡ مِتُّ قَبۡلَ ھٰذَا وَکُنۡتُ نَسۡیًا مَّنۡسِیًّا (۱۹/۲۳)

سوالات

تقاریر کے بعد مختلف لوگوں کی طرف سے کچھ سوالات پوچھے گئے۔ یہ سوال اور ان کے مختصر جوابات درج ذیل کئے جاتے ہیں۔ (طلوع اسلام)

(۱) سوال: ہم غریب اس آسرے پر جیتے ہیں کہ اس دنیا میں ہم مصیبتوں میں زندگی بسر کرلیں۔ اگلی دنیا میں تو جنت ہمارے لئے ہوگی آپ نے وہ جنت بھی ہم سے چھین لی۔ یہ تو بڑا ظلم ہے۔

جواب: یہ جنت میں نہیں چھین رہا۔ جب قرآن بھوک کو خدا کا عذاب قرار دیتا ہے تو میں اسے کس طرح اس کی رحمت قرار دیدوں بات یہ ہے کہ قرآن کسی کے غلط جذبات کی کوئی پرواہ نہیں کرتا لَيْسَ بِأَمَانِيِّكُمْ وَلَا أَمَانِيِّ أَهْلِ الْكِتَابِ (۴/۱۲۳) تمہاری آرزوؤں کے مطابق ہوگا اور نہ ہی تمہارے فریق مخالف (اہل کتاب) کی آرزوؤں کے مطابق۔ ہوگا سب کچھ خدا کے اٹل قانون کے مطابق اور اس کا اٹل قانون یہی ہے کہ مَنْ كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ (۱۷/۷۲) یہاں کا اندھا وہاں کا بھی اندھا ہوگا اتنا اور عرض کردوں کہ کسی ہنگامی حادثہ سے کسی فرد یا قوم کا وقتی طور پر مفلوک الحال ہوجانا اور بات ہے اور اس کا اس مفلسی اور فلاکت کو خدا کی رحمت سمجھ کر اس حالت پر مطمئن ہو جانا اور بات۔ دنیا اور آخرت کی رسوائی اس دوسری صورت کا لازمی نتیجہ ہے

(۲) سوال: اعمیٰ کے معنی عقیدے کی گمراہی ہے اسے معاشی معاملات سے کیا تعلق ہے؟

جواب: قرآن نے معاشی معاملات کے ساتھ اس کا گہرا تعلق بتایا ہے۔ سورۂ طٰہٰ میں ہے وَمَنْ أَعْرَضَ عَن ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَعْمَىٰ (۲۰/۱۲۴) جو ہمارے قانون سے اعراض برتے گا ہم اس کی روزی تنگ کردیں گے اور روز قیامت میں اسے اعمیٰ (اندھا) اٹھائیں گے۔ نیز خود سورۂ بنی اسرائیل میں جہاں یہ آیت آئی ہے کہ وَمَن كَانَ فِي هَٰذِهِ أَعْمَىٰ فَهُوَ فِي الْآخِرَةِ أَعْمَىٰ (۱۷/۷۲) اس سے پہلے انسان کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَرَزَقْنَاهُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلَىٰ كَثِيرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا (۱۷/۷۰) لہٰذا خوشگوار رزق سے محرومی اور دیگر مخلوق کے مقابلے میں عدم سرفرازی اعمیٰ ہونے کی دلیل ہے۔

(۳) سوال: اس اعتبار سے تو اقوام یورپ جنہوں نے قوائے فطرت کو مسخر کرلیا ہے، مومنین کی جماعتیں قرار پاجائیں گی۔

جواب: اقوام یورپ نے خدا کے طبعی قانون پر عمل کیا ہے اور وہ اس کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہیں مَا كَانَ عَطَاءُ رَبِّكَ مَحْظُورًا (۱۷/۲۰) خدا نے اپنے عطیات کے آگے دیوار نہیں کھینچ دی کہ کسی قوم کے لئے اس کے پھاٹک کھول دیئے جائیں اور کسی کو اس سے روک دیا جائے۔ اس کے قوانین طبعی پر جو قوم بھی عمل پیرا ہوگی وہ اس کے نتائج سے ثمریاب ہوجائے گی كُلًّا نُّمِدُّ هَٰؤُلَاءِ وَهَٰؤُلَاءِ مِنْ عَطَاءِ رَبِّكَ (۱۷/۲۰) لیکن اتنے سے کوئی قوم مومن نہیں قرار پاجاتی۔ مومن وہ ہے جو خدا کے طبعی قوانین کے ساتھ اس کے انسانیت سے متعلق قوانین (مستقل اقدار) پر بھی عمل پیرا ہو۔ یہ قوانین قرآن کریم کے اندر ہیں۔ صورت یہ ہے کہ

(۱) جو قوم خدا کے طبعی قوانین پر عمل پیرا ہوتی ہے۔ اسے طبعی کائنات کے مفاد عاجلہ حاصل ہو جاتے ہیں لیکن اس کا مستقبل تاریک ہوتا ہے۔

(۲) جو قوم طبعی قوانین کے ساتھ مستقل اقدار پر بھی عمل پیرا ہوتی ہے۔ اس کا حال بھی روشن ہوتا ہے اور مستقبل بھی۔ اور

(۳) جو قوم نہ طبعی قوانین پر عمل کرتی ہے نہ مستقل اقدار پر۔ اس کا حال بھی تاریک ہوتا ہے اور مستقبل بھی۔

(۵) سوال:- تم نے قرآن کی آیت اَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا کا ترجمہ کرتے ہوئے یہ کہا ہے کہ خدا زمین کو بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھوں سے سمٹا کر کم کرتا جارہا ہے۔ یہ بجز تحریف اور الحاد ہے۔ تم نے اس سے قرآن کو بازیچہ بنادیا ہے قرآن میں من اطرافھا ہے۔ اس میں سرداران قوم کا کہیں ذکر نہیں۔

جواب:- آپ عربی کی کوئی مستند لغت اٹھائیے۔ اور اس میں دیکھئے کہ اطراف کے معنی سرداران قوم دیئے گئے ہیں یا نہیں۔

(۶) سوال:- آپ نے ہر جگہ قانونِ خداوندی کی اطاعت کا ذکر کیا ہے۔ اس سے خدا کہیں باقی نہیں رہتا۔ صرف اس کا قانون رہ جاتا ہے۔ یہ تو خدا کا انکار ہے۔

جواب:- آپ جب قرآن کی اطاعت کرتے ہیں تو اسے خدا کی اطاعت کہتے ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ یہ تو کتاب اللہ کی اطاعت ہے۔ خدا کی اطاعت نہیں تو آپ اس کا کیا جواب دیں گے؟ کیا کتاب اللہ کی اطاعت سے (معاذ اللہ) خدا کا انکار ہوگا؟ کتاب کے معنی بھی قانون ہی ہیں۔ اس لئے میں قانونِ خداوندی کی اطاعت کہتا ہوں۔ قانون خداوندی کی اطاعت اس لئے کہتا ہوں کہ اس قانون کے دو حصے ہیں۔ ایک قانون طبعی ہے جو خارجی کائنات میں پھیلا ہوا ہے۔ اس قانون کے مطابق زندگی بسر کرنا بھی ضروری ہے۔ دوسرا قانون انسان سے متعلق ہے اور مستقل اقدار پر مشتمل۔ یہ قانون قرآن کریم کے اندر ہے۔ اور اس کی اطاعت بھی نہایت ضروری۔ لہٰذا قانونِ خداوندی کی اطاعت سے مفہوم یہ ہے کہ انسان خدا کے قانونِ طبعی کے مطابق فطرت کی قوتوں کو مسخر کرے اور ان کے حاصل کو قرآنی قانون کے مطابق نوعِ انسانی کی نشو و نما کے لئے صرف کرے۔ فرمائیے! یہ خدا کا انکار ہے یا اس کا صحیح صحیح اقرار؟ یاد رکھئے اللہ تعالیٰ سے ہمارا تعلق صرف اس کے قانون کے ذریعے ہے۔ لہٰذا اس کے قانون کی اطاعت، عین اطاعت خداوندی ہے۔ اس کی اطاعت کا اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ نہیں۔ نہ اس سے تعلق پیدا کرنے کا کوئی اور ذریعہ۔

(۷) سوال:- کیا رسول اللہ کے زمانہ میں بھی افرادِ معاشرہ کی رزق کی ذمہ داری نظام کے سر تھی؟

جواب:- اس کا اصولی جواب تو یہ ہے کہ رسول اللہ نے قرآن کے مطابق عمل فرمایا تھا۔ اس لئے اگر آپ اس سے متفق ہیں کہ قرآن کی رو سے افرادِ معاشرہ کے رزق کی ذمہ داری نظام پر ہے تو حضورؐ نے جو نظام متشکل فرمایا تھا۔ اس میں بھی لامحالہ یہی صورت ہوگی۔ اتفاق سے اس کے لئے ہمارے پاس تاریخی شہادت بھی موجود ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ حکومت کی طرف سے تمام افرادِ مدینہ کے وظائف مقرر تھے۔ یہی وہ وظائف تھے جو پہلے بچے کے دودھ چھڑانے کے بعد سے دیئے جاتے تھے۔ لیکن ان کے متعلق بعد میں حضرت عمرؓ نے حکم دیا تھا کہ وہ بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی ملنے لگ جایا کریں۔

(۸) سوال:- کیا خلافتِ راشدہ میں زمینیں حکومت کی مشترکہ تحویل میں تھیں؟

جواب:- اس سوال کا اصولی جواب وہی ہے جو میں نے سابقہ سوال کے جواب میں عرض کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی تاریخ

ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا تھا کہ عراق وغیرہ کی مفتوحہ زمینیں، افراد میں نہ بانٹی جائیں۔ بلکہ حکومت کی تحویل میں ہیں اس ضمن میں اس حقیقت کا سمجھ لینا ضروری ہے کہ بنیادی سوال یہ ہے کہ تمام افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی کی بہم رسانی اور ان کی صلاحیتوں کے نشو ونما پانے کے اسباب و ذرائع کی فراہمی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ حکومت اس اہم فریضہ کی سرانجام دہی کے لئے زمانہ کے احوال وظروف کے مطابق عملی تدابیر خود طے کرے گی۔ قرآن نے اس کے لئے اصول یہ دیا ہے کہ ذرائع پیداوار تمام افراد کی ضروریات پوری کرنے کے لئے کھلے رہنے چاہئیں اور فاضلہ دولت (SURPLUS MONEY) کسی کے پاس نہیں رہنی چاہیئے۔

(۹) سوال: آپ نے جو کچھ کہا ہے۔ ہم اس سے متفق ہیں۔ اب یہ بتایئے کہ موجودہ حالات میں اس قرآنی انقلاب کے لئے کیا قدم اٹھایا جائے۔

جواب:- اس کے لئے قرآن نے کہا ہے کہ اَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ، اس کا فیصلہ باہمی مشاورت سے کیجئے۔ جو لوگ قرآن کے اس پیغام پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور سوچیں کہ اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے کیا عملی قدم اٹھایا جائے۔ لیکن جو قدم بھی اٹھایا جائے۔ وہ کسی حال میں بھی حدود اللہ سے تجاوز نہ کرے۔

قرآنی انقلاب کا لٹریچر

معراج انسانیت از:- پرویز
سیرت صاحب قرآن علیہ التحیۃ والسلام کو قرآن کے آئینے میں دیکھنے کی پہلی اور کامیاب کوشش۔ مذاہب عالم کی تاریخ اور تہذیبی پس منظر کے ساتھ ساتھ حضور سرورِ کائنات کی سیرت اور دین کے متنوع گوشے نکھر کر سامنے آگئے ہیں بڑے سائز کے قریباً نو سو صفحات قیمت بتیس روپے

ابلیس و آدم از:- پرویز
سلسلہ معارف القرآن کی پہلی جلد جسے نظر ثانی کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ انسانی تخلیق۔ قصہ آدم۔ جنات ملائکہ وحی وغیرہ جیسے اہم مباحث کی حامل۔ بڑی تقطیع کے ۳۷۶ صفحات۔ قیمت آٹھ روپے

جوئے نور از:- پرویز
سلسلہ معارف القرآن کی دوسری کڑی جو حضرات انبیائے کرام کے تذکار جلیلہ پر مشتمل ہے۔ جس میں حضرت نوحؑ سے کر حضرت شعیبؑ تک تمام انبیائے کرام علیہم التحیۃ والسلام کا تذکرہ آگیا ہے۔ قیمت چھ روپے

انسان نے کیا سوچا از:- پرویز
فکر انسانی کی آج تک کی تاریخ کہ انسان نے اپنی مشکلات و مسائل کو حل کرنے کے لئے آج تک کیا سوچا ہے۔ محترم پرویز صاحب کی بلند پایہ تصنیف۔ قیمت دس روپے

نظام ربوبیت از:- پرویز
انسان کے معاشی مسائل کا قرآنی حل اور ذاتی ملکیت کا قرآنی تصور دورِ حاضرہ کی عظیم کتاب۔ صفحات ۳۰۰۔ قسم اول چھ روپے۔ قسم دوم غیر مجلد چار روپے

(محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار ہوگا)

ملنے کا پتہ:- ناظم ادارہ طلوع اسلام ۲/۲۹ ڈی، ایل۔ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ سوسائٹی کراچی

امریکہ اور یہودی

[یہودیوں کی فلسطینی حکومت مسلمانانِ عالم کے قلب میں نشتر کی حیثیت رکھتی ہے جس کے درد سے ہر آنکھ پُرنم ہے۔ امریکہ کو بالعموم مسلمان سلطنتیں اپنا دوست سمجھتی ہیں لیکن امریکہ کی ساری ہمدردیاں اسرائیلی حکومت کے ساتھ ہیں امریکہ سے شائع ہونے والے مشہور رسالہ لائف (LIFE) کی ۲ر اپریل ۱۹۵۶ء کی اشاعت میں ایک مقالہ افتتاحیہ شائع ہوا ہے جو اس قابل ہے کہ مسلمانانِ عالم اسے نہایت غور سے پڑھیں اور پھر سوچیں کہ مسلمانوں کو اسرائیلی خطرے سے بچانے کے لئے ہم کیا کر رہے ہیں۔ اور اس باب میں امریکہ کا نقطۂ نگاہ کیا ہے۔ ذیل میں اس اہم مقالہ کا آزاد ترجمہ شائع کیا جاتا ہے۔ طلوعِ اسلام]

دوسری عالمگیر جنگ کے بعد سے مشرقِ وسطیٰ کے متعلق اہلِ امریکہ کے خیالات بڑی وسعت اختیار کر رہے ہیں حتّٰے کہ ان میں بعض خیالات باہمدگر متضاد بھی ہیں، چونکہ اہلِ امریکہ ہر مقام پر ترقی کے طرفدار ہیں۔ اس لئے انھوں نے جب دیکھا کہ کرنل جمال عبدالناصر مصر کی جاگیردارانہ شہنشاہیت کا تختہ الٹ کر اس کی جگہ جمہوری نظام کے قیام کے لئے کوشاں ہے تو اہلِ امریکہ نے اپنی ہمدردیاں جمال ناصر کے ساتھ وابستہ کر دیں۔ چونکہ اہلِ امریکہ استعماریت کے قدیمی دشمن ہیں۔ اس لئے جب انھوں نے محسوس کیا کہ شمالی افریقہ کے عرب اور جزیرہ قبرص کے باشندے آزادی کے خواہاں ہیں تو انھوں نے ان کی کوششوں کو بنظرِ استحسان دیکھا۔ اسی طرح انھوں نے متعدد وجوہات کی بناء پر یہودیوں کے اس حق کی بھی تائید کی کہ وہ اپنی جداگانہ قوم تشکیل کر لیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ امریکہ نے اس مقصد کے حصول کے لئے انھیں مدد بھی دی۔ اور سب سے پہلے ان کی آزاد حکومت کو تسلیم کر لیا۔ ان متعدد وجوہات میں غیر شعوری طور پر یہ جذبہ بھی کارفرما تھا کہ امریکہ میں اکثریت عیسائیوں کی ہے جن کے قوانین کا ماخذ عہد نامہ عتیق ہے۔ اس بناء پر وہ سمجھتے تھے کہ یہودی کلچر کا ہمارے ذمہ ایک قرض ہے۔ جس کی ادائیگی کی یہی صورت ہو سکتی ہے۔ اس سے ذرا نچلی سطح پر حکومت امریکہ کا یہ اقدام اس ملک کی عملی سیاست کے تقاضوں پر بھی مبنی تھا۔ امریکہ میں قریب بارہ لاکھ یہودی بستے ہیں۔ اور ایک منظم، موثر اور طاقتور اقلیت کی حیثیت لئے ہوئے ہیں۔ امریکہ میں کئی شہر اور ریاستیں ایسی ہیں جہاں یہودیوں کے ووٹ الیکشن میں فیصلہ کن ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ بات ڈھکی چھپی نہیں کہ پریذیڈنٹ ٹرومین نے اسرائیلی حکومت کی حمایت امریکن یہودیوں سے ووٹ حاصل کرنے کے لئے کی تھی۔

ایک طرف مشرقِ وسطیٰ کی سیاست کے متعلق امریکی رجحانات اس طرح متعین ہو رہے تھے، اور دوسری طرف امریکہ کے لیے اقتصادی

مفاد ابھرتے چلے آتے تھے۔ جو ان کے رجحانات اور پالیسی دونوں کو متاثر کرتے رہتے تھے۔ امریکہ کی تیل کی کمپنیاں سعودی عرب میں یوں تو محض وہاں کی تیل کی صنعت کو نشو و نما دے رہی تھیں لیکن انھوں نے جلدی محسوس کر لیا کہ وہ مقامات ایسے اہم ہیں کہ اگر کل کو کوئی عالمگیر جنگ چھڑ گئی تو ان مقامات کا امریکہ کے ہاتھوں میں رہنا عسکری نقطۂ نگاہ سے نہایت مفید ہوگا۔ دوسری طرف سعودی عرب بھی چاہتے تھے کہ وہ امریکہ کو اپنے ہاں آنے دیں۔ تاکہ وہاں سے انگریز کا تسلط ٹوٹ جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی مشکل یہ تھی کہ سعودی عرب کے باشندے مسلمانانِ عالم کے اتحاد کے بالعموم اور عرب مسلمانوں کے اتحاد کے بالخصوص حامی تھے۔ اس لئے اسرائیلی حکومت کی مخالفت ان کے دل میں جنون کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ انھیں تیل کی آمدنی اس قدر ہوئی کہ وہ بے تحاشا خرچ کرنے سے بھی ختم نہیں ہوتی تھی۔ لہٰذا اس بچت کا صحیح مصرف انھوں نے یہی سمجھا کہ وہ اس روپیہ کو مصر، شرقِ اردن یا اسی قسم کی دوسری سلطنتوں کو دیدیں۔ تاکہ وہ سلطنتیں کسی نہ کسی طرح اسرائیلی حکومت کو تباہ کر دیں۔

اہلِ امریکہ کے لئے یہ امر بڑا یاس انگیز ہے کہ مصر کا جمال ناصر مختلف قوتوں کی آماجگاہ بن گیا۔ کہاں یہ صورت تھی کہ اس کے سامنے مقصد صرف یہ تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے ملک کو غربت اور افلاس کے پنجے سے چھڑا لے۔ اور کہاں یہ صورت پیدا ہو گئی کہ وہ عربی ممالک کی قیادت کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگ گیا۔ جمال ناصر کے دل میں یہودیوں کے خلاف نفرت کا جذبہ اتنا شدید نہیں تھا جتنا دوسرے عربوں کے دل میں تھا۔ لیکن قیادت کی ہوس نے اسے مجبور کر دیا کہ وہ اسرائیل کے خلاف اعلانِ جنگ میں سب سے پیش پیش ہو۔ اس مقصد کے لئے وہ قاہرہ کے ریڈیو اسٹیشن سے نہ صرف یہودیوں کے خلاف بلکہ پوری مغربی دنیا کے خلاف نہایت کذب آمیز پروپاگنڈہ کرتا رہتا ہے۔ وہ ان امریکیوں کو جو اس کی جنگِ آزادی کی کوشش میں اس کے مؤید تھے مطعون کرتا ہے کہ فرانس شمالی افریقہ کے عربوں کو جو آزاد نہیں ہونے دیتا تو وہ ایسا امریکہ کی شہ پر کر رہا ہے۔ قاہرہ ریڈیو تمام مغربی اقوام کو ایک ہی لاٹھی سے ہانکتا ہے وہ انھیں عربوں کی آزادی کا دشمن اور استعمار پسند قرار دیتا ہے۔ اس مقصد کے لئے ناصر نے روس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کی کوششیں شروع کر دی ہیں۔ اس سے اس نے مشرقِ وسطیٰ میں بے شمار مشکلات کے دروازے کھول دیئے ہیں۔ اور اسے اس حالت تک پہنچا دیا ہے کہ وہاں ایک چھوٹی سی چنگاری جنگ کے شعلے بھڑکا دینے کے لئے کافی ہو سکتی ہے۔

ادھر مشرقِ وسطیٰ میں اس قسم کے واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ اور ادھر یہودیوں کے متعلق اہلِ امریکہ کی رائے پختہ سے پختہ تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ مختصر الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اہلِ امریکہ یہ سمجھتے ہیں کہ اب وقت آ چکا ہے کہ عربوں کے دوست لگی لپٹی بغیر عربوں سے کھلے کھلے الفاظ میں کہہ دیں کہ:

> فلسطین میں یہودیوں کی حکومت قائم ہو چکی ہے۔ اور وہ اسی طرح سے قائم رہے گی۔ اہلِ امریکہ نے یہودیوں کو ایک قوم بننے کے لئے مدد دی تھی۔ انھوں نے سب سے پہلے ان کی حکومت کو تسلیم کیا تھا۔ وہ اپنے دل میں یہودیوں کے لئے گہری دوستی کے جذبات رکھتے ہیں۔ اس لئے اہلِ امریکہ یہ دیکھیں گے کہ وہ کونسی قوت ہے جو یہودیوں کو فلسطین سے ہٹا سکتی ہے۔ جب تک عرب اس مسلّمہ حقیقت کا اعتراف نہ کریں کہ یہودی فلسطین میں ہمیشہ ہمیشہ رہنے کے لئے

آباد ہوتے ہیں۔ اس وقت تک عربی ممالک میں کبھی امن پیدا نہیں ہو سکتا۔

بعض امریکن یہ بھی کہیں گے کہ:۔

اے عربو! یہ صرف تم ہی کہہ رہے ہو کہ فلسطین میں امن نہیں ہے۔ اسرائیلی یہ کبھی نہیں کہتے کہ ہم عربی دنیا کو تباہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس تم قدم قدم پر اعلان کرتے پھر رہے ہو کہ ہم یہودیوں کو تباہ کر کے رہیں گے۔ یہ تمہارے مقدس مذہبی پیشوا ہیں جو آئے دن یہودیوں کے خلاف جہاد کے نعرے بلند کرتے رہتے کہ ہم یہودیوں کو سمندر میں دھکیل دیں گے یہ تم ہو جو یہودیوں کے حق زلیست کو تسلیم نہیں کرتے جب تک تم ان کے اس حق کو تسلیم نہیں کرو گے۔ دنیا کے سامنے تمہارے دعوے کی کوئی حقیقت نہیں ہوگی۔

امریکن سمجھتے ہیں کہ اس وقت مشرق وسطیٰ میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ افسوسناک بھی ہے اور خطرناک بھی۔ لیکن اس کی ذمہ داری عربوں پر ہے عربوں نے یہودیوں کے خلاف نفرت کے جو جذبات ابھارے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس خطۂ زمین میں کمیونزم کے پرامن نفوذ کے لئے دروازے کھول دیئے ہیں اور یہ کسے معلوم نہیں کہ روس دورۂ حاضرہ میں سب سے بڑا استعماریت پسند ہے۔ مصر میں روس سے سامان جنگ آدھی قیمت پر آنا شروع ہو گیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی روسی صنعت کار بھی۔ شام میں کمیونسٹ ایجنٹس پہلے ہی سے گھس آئے ہوئے ہیں۔ ان کی کوشش یہ ہے کہ وہاں بھی کمیونزم اسی طرح چھا جائے جس طرح مصر میں چھائی ہوئی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس کی قیمت کیا ہوگی؟ شام بحیثیت ایک آزاد مملکت کے ختم ہو جائے گا۔

ایک زمانہ تھا کہ جمال ناصر روسی خطرہ کا رونا رویا کرتا تھا۔ اور چاہتا تھا کہ مشرق وسطیٰ میں کوئی مدافعانہ محاذ بنایا جائے جس میں مصر شریک ہو سکے لیکن جب ترکی ایران، عراق اور پاکستان نے روس کے پھیلاؤ کو روکنے کے لئے اس قسم کا محاذ بنایا۔ تو ناصر نے اس کے خلاف آواز بلند کر دی۔ سعودی عرب، شرق اردن کی طرف رشوت کا روپیہ منتقل کر رہا ہے۔ تاکہ اس کی گلیوں میں شورش برپا ہو جائے اور مصر سب کچھ دیکھتا ہوا چشم پوشی کر لیتا ہے۔ اسی رشوت کا نتیجہ ہے کہ شاہ حسین کو گلب پاشا جیسا تجربہ کار جنگ آزما سپاہی جس نے عرب لیجن کو اس قدر مضبوط بنا رکھا تھا معطل کر دینا پڑا۔

یہ سب کچھ بڑا افسوسناک ہے لیکن اس سے کہیں افسوسناک یہ امر ہے کہ اس تمام انتشار کی ذمہ داری ناصر جیسی شخصیت پر ہے۔ ناصر سب کچھ جانتا ہے اور اس میں اس کی صلاحیت موجود ہے کہ وہ بہترین سیاست داں بن سکے۔ جب ناصر نے اپنے ملک میں انقلاب شروع کیا ہے تو امریکنوں کو اس سے بات چیت کا موقعہ ملا تھا۔ اس بات چیت سے انھیں یقین ہو گیا تھا کہ اس کی دیانتدارانہ خواہش یہ ہے کہ وہ اپنے ملک کو افلاس اور استبداد کے اس جہنم سے نجات دلائے جس میں وہ صدیوں سے گرفتار چلا آ رہا ہے۔ لیکن یہودیوں کی مخالفت کے شور و غوغا نے ناصر کو بھی انھیں راستوں پر چلا دیا جس پر اس سے پہلے کئی ایسے لیڈر چل چکے ہیں۔ جنھوں نے اپنے ملک کی اندرونی فلاح و بہبود کے مقابلے میں خارجی سیاست میں دخل اندازی کو ترجیح دی۔

امریکنوں کا خیال ہے کہ ناصر جیسا اعتدال پسند لیڈر جس نے تشدد پسند اخوان المسلمین کو دبا کر رکھ دیا ہے۔ اب مصر کے مفاد کو

عرب اتحاد کی قربان گاہ پر ذبح کر رہا ہے۔ یہ امر کس قدر افسوسناک ہے کہ جس شخص نے معمار قوم بننا تھا، وہ یونہی غوغا پسند بن کر رہ گیا ہے۔ یہ شخص جو اب نسلی منافرت کی آگ کو اس طرح ہوا دے رہا ہے، وہی ہے کہ جب وہ ۱۹۴۸ء میں یہودیوں کے خلاف لڑتا ہوا زخمی ہوا تھا، تو اس نے اپنے سپاہیوں سے کہا تھا کہ "رفیقو! ہمارے لئے جہاد کا میدان یہ نہیں بلکہ خود ہمارے گھر کی سرزمین ہے"۔ جیسا کہ اس نے اس وقت کہا تھا اب بھی جانتا ہے کہ اس کا جہاد درحقیقت اپنی قوم کی جہالت اور فلاکت کے خلاف ہونا چاہیئے۔ ناصر جہاد کے احمقانہ نعروں کو خاموشی سے سن رہا ہے۔ اور اس کے ملک کے پیچھے مختلف بیماریوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو رہے ہیں۔ اور وہ امریکن امداد سے انکار کرکے اس تباہی و بربادی میں اور بھی اضافہ کر رہا ہے۔

امریکن جانتے ہیں کہ اس وقت کسی عرب لیڈر کے لئے خواہ وہ ناصر ہی کیوں نہ ہو، یہ ناممکن ہو چکا ہے کہ وہ اس نسلی منافرت کی رو کے خلاف آواز اٹھا کر اقتدار کا مالک رہ سکے۔ لیکن ایک جہالت آمیز رو کے ساتھ بہتے جانا تو کوئی خوبی نہیں ہے۔ وقت کی پکار یہ ہے کہ عرب اقوام کوئی اتنا بڑا قائد پیدا کریں جو اس رو کی مخالفت کرے اور اس کے باوجود قوم کے دلوں میں اپنی عظمت کا سکہ بٹھا سکے۔ یہی وہ لیڈر ہو گا جسے باقی دنیا خوش آمدید کہے گی۔ اگر اہل امریکہ کو ناصر سے بات کرنے کا موقعہ ملے تو وہ اس سے یہی کہیں گے کہ

> تم اپنی قوم کو روشنی کی طرف لے جاؤ۔ ایسا نہ ہونے دو کہ مذہبی دیوانے تمہیں تاریکی کی طرف ہانک کرلے جائیں۔ کہتے ہیں کہ تم نے کبھی اپنے آپ کو اشتعال میں نہیں آنے دیا۔ تم اپنی قوم کی اس طرح قیادت کرو کہ وہ عقل و خرد کو اپنے ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ تم اپنی قوم کو ان شکاریوں کے حوالے نہ کرو جو منافرت کے جذبات بھڑکا کر اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔ تم انہیں اس صبر و استقامت کی تلقین کرو جس کے تم مالک ہو۔ قسمت نے تمہیں عظمت اور بلندی کا ایک زریں موقعہ دیا ہے۔ اسے یونہی سستے داموں بیچ کر ضائع نہ کرو۔

امریکنوں نے جب بھی یہودیوں کو غلطی پر دیکھا تو ہمیشہ ان پر تنقید کی ہے۔ جب یہودی ان دس لاکھ عرب مہاجرین کو آباد کرنے یا انہیں معاوضہ دینے میں ناکام رہے جو ۱۹۴۸ء میں اپنے گھروں سے نکالے گئے تھے، تو کتنے ہی امریکن تھے جن کے دل میں اس سے اضطراب کی لہر دوڑ گئی۔ پریسیڈنٹ آئیزن ہاور نے جب یہودیوں اور عربوں میں غیر جانبدارانہ پالیسی اختیار کی تو اس کی اس حکمت عملی کو امریکہ میں عام طور پر سراہا گیا۔ جب امریکہ نے اسرائیلی حکومت کو تسلیم کیا ہے تو یہ اس لئے نہیں تھا کہ اسرائیلی فی الحقیقت اپنی حکومت قائم کر چکے تھے، یہ اس لئے کیا گیا تھا کہ امریکن یہ سمجھتے تھے کہ ان مصائب کے بدلے میں جو یہودیوں پر دوسرے ممالک میں روا رکھے گئے تھے، یہودیوں کو کسی جگہ اپنا گھر بنانے کا حق حاصل ہے۔ امریکن یہودیوں کے اس حق کی ہمیشہ حمایت کریں گے کہ وہ اپنے اس گھر میں امن سے رہیں۔ جب تک عرب ان کے اس حق کو تسلیم نہیں کرتے اور یہودیوں کے مٹانے کی ناجائز خواہش کو اپنے دل سے نکال نہیں دیتے، عربوں کے ان دعاوی کے طے ہو جانے کی کوئی شکل پیدا نہیں ہو سکتی جو حق اور عدل پر مبنی ہیں۔

امریکنوں کا عقیدہ یہ ہے کہ عرب یہودیوں کی حقیقت کو اپنے دل میں جگہ نہ دے کر امن عالم سے جوا کھیل رہے ہیں۔

یہ ہیں اہلِ امریکہ کے خیالات اس مسئلہ کے متعلق جو دنیا بھر کے مسلمانوں کیلئے وجۂ صد اضطراب بن رہا ہے۔ آپنے اس منطق کو بھی ملاحظہ فرمایا، جس کی بناء پر اہلِ امریکہ، یہودیوں سے اس قدر ہمدردی کر رہے ہیں! منطق یہ ہے کہ چونکہ جنگ کے دوران میں جرمنی نے یہودیوں کو ستایا تھا۔ اور انہیں ان کے گھروں سے نکال دیا تھا۔ اس لئے عدل و انصاف کا تقاضا تھا کہ یہودیوں کو کسی خطۂ زمین میں بسایا جائے۔ یہ خطۂ زمین فلسطین ہے۔ یعنی انہیں ستایا تھا جرمنوں نے اور اس کی سزا دی گئی عربوں کو! اگر امریکہ کا دل عدل و انصاف کے لئے ایسا ہی تڑپتا تھا۔ تو انھوں نے یہودیوں کو اپنے ہاں کیوں نہ بسا لیا! بہرحال کہنے کی بات صرف اتنی ہے کہ مسلمانوں کا دنیا میں کوئی دوست نہیں، اور یہ بات اچنبھے کی نہیں، کمزور کا کوئی بھی دوست نہیں ہوا کرتا۔ اس لئے شکوہ امریکہ سے نہیں خود مسلمانوں سے ہے جو اپنی کمزوری دور کرنے کی فکر نہیں کرتے۔ اور تقشّف کی زندگی کو اطمینان اور آرام کی زندگی قرار دے کر اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔

طلوعِ اسلام

طلوعِ اسلام کا انقلابی لٹریچر

مقامِ حدیث — حدیث کے متعلق تمام اہم سوالات کے تفصیلی جواب۔ احادیث کے متعلق اتنی معلومات کسی جگہ یکجا نہیں ملینگی۔ دو جلدیں۔ ہر جلد کے تقریباً چار سو صفحات اور قیمت فی جلد چار روپے

قرآنی دستورِ پاکستان از:- پرویز — اس میں پاکستان کے لئے قرآنی دستور کا خاکہ دیا گیا ہے۔ اور حکومت، علماء اور اسلامی جماعت کے مجوزہ دستوروں پر تنقید کی گئی ہے۔ ۲۲۴ صفحات قیمت دو روپے آٹھ آنے

اسلامی نظام — اسلامی مملکت کے بنیادی اصول کیا ہیں اور اسلامی نظام کیسے قائم ہو سکتا ہے۔ اسکے جواب میں جناب پرویز اور علامہ اسلم جیراجپوری کے مقالات جنھوں نے فکر و نظر کی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ ۱۰۰ صفحات۔ قیمت دو روپے

نوادرات از:- علامہ اسلم جیراجپوری — علامہ موصوف کے مضامین کا نادر مجموعہ۔ بڑا سائز صفحات ۴۰۰۔ قیمت چار روپے۔

اسلامی معاشرت از:- پرویز — مسلمانوں کے عادات و اخلاق کا خاکہ، اٹھنے بیٹھنے کے ڈھنگ۔ سرکاری ملازمین کے فرائض و واجبات انفرادی و اجتماعی زندگی کا ہر اسلوب قرآنی آئینہ میں۔ قیمت دو روپے

ملنے کا پتہ:- **ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۳/۱۵۹۔ ایل۔ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ۔ سوسائٹی کراچی ۲۹**

مجلسِ اقبال *

مثنوی اسرارِ خودی ۔ باب نہم

(مسلسل)

مرحلۂ سوم ۔ نیابتِ الٰہی

زیرِ نظر باب کے پہلے دو حصوں میں علامہ اقبال بتا چکے ہیں کہ انسانی خودی کی تربیت اور استحکام کے لئے اطاعت اور ضبطِ نفس ضروری ہے۔ یعنی قوانینِ الٰہیہ کی بطیبِ خاطر اطاعت اور اگر اس ضمن میں انسانی نفس کے رجحانات اسے قانون شکنی کی طرف مائل کریں تو اپنے آپ پر پورے کنٹرول سے ان رجحانات کا مقابلہ۔ اس کے بعد وہ تربیتِ خودی کے تیسرے مرحلہ کی طرف آتے ہیں۔ اس کا نام ان کی اصطلاح میں نیابتِ الٰہی ہے۔ اگر بنظرِ تعمق دیکھا جائے تو نیابتِ الٰہی تربیتِ خودی کا تیسرا مرحلہ نہیں بلکہ پہلے دو مراحل (اطاعت اور ضبطِ نفس) کا فطری نتیجہ ہے۔ یا یوں کہیے کہ جو اطاعت اور ضبطِ نفس سے اپنی خودی میں استحکام پیدا کرلیں۔ ان کا فریضۂ زندگی۔

اس ضمن میں سب سے پہلے نیابتِ الٰہی کا صحیح مفہوم سمجھ لینا ضروری ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ آدم خلیفۃ اللہ علی الارض ہے۔ یعنی زمین میں خدا کا خلیفہ اور اس کی سند اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً کی آیت ہے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھیے کہ نہ اس آیت میں اور نہ ہی کسی دوسرے مقام پر قرآن نے آدم کو اللہ کا خلیفہ کہا ہے۔ خلیفہ کے معنی ہیں جانشین (SUCCESSOR)۔ اس آیت میں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ انسان دنیا میں اپنے سے پہلی آبادیوں کا جانشین ہے۔ قصۂ آدم، انسان کی تمدنی زندگی کے آغاز کی تمثیلی داستان ہے۔ اس کی ابتدا اسی سے ہوتی ہے کہ پہلی (SPECIES) یا نیم حیوانی نیم انسانی زندگی کے بعد اب دنیا میں انسانی زندگی کا دور آ رہا ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ جانشین یا نائب ہمیشہ اس کا ہوتا ہے جو خود اس مقام پر موجود نہ ہو۔ جو خود کسی مقام پر ہو۔ وہاں اس کے قائم مقام یا نائب کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ کائنات کے ہر مقام پر موجود ہے۔ وہ تو اس کی رگِ حیات میں بمنزلہ روح رواں ہے اور جب وہ ہر جگہ خود موجود ہے تو پھر اس کے نائب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

تیسری بات یہ ہے کہ نائب وہ ہوتا ہے جسے حاکم اعلیٰ اپنے بعض اختیارات تفویض (DELEGATE) کر دے۔ یہ ظاہر ہے کہ جو اختیارات تفویض کر دیئے جائیں تو وہ خود حاکم اعلےٰ کے پاس نہیں رہتے۔ اس بنا پر یہ تصور کرنا بھی غلط ہے کہ خدا نے اپنے بعض اختیارات انسان کو تفویض کر دیئے ہیں اور خود ان اختیارات سے عاری ہو گیا ہے۔

قرآن کی رو سے انسان کی پوزیشن یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ہر فرد انسانیہ کے اندر ایسی صلاحیتیں رکھدی ہیں جن کی مناسب نشو و نما اور تربیت سے اس کے اندر ایک محدود پیمانے پر وہ قوتیں پیدا (یا بیدار) ہو جاتی ہیں جنھیں لامحدود انداز پر صفات خداوندی (اسماء الحسنیٰ) کہا جاتا ہے۔ یہ قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں قرآنی پروگرام پر عمل پیرا ہونے سے۔ اس پروگرام کی رو سے ایک ایسا معاشرہ متشکل ہوتا ہے جس میں افراد معاشرہ کی مضمر صلاحیتیں نشو و نما پاتی چلی جاتی ہیں۔ اس معاشرے کا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ اس نظام کو وسیع سے وسیع تر کرتے چلے جائیں۔ تاآنکہ (قرآنی تصور کے مطابق) یہ تمام نوع انسانی کو محیط ہو جائے۔ یہ جماعت جس کے افراد میں یہ قوتیں بیدار ہو جائیں، جماعت مومنین کہلاتی ہے۔ یہ جماعت قوانین خداوندی کو جس پر یہ سب سے پہلے خود عمل پیرا ہوتی ہے دنیا میں رائج کرتی ہے۔ یہ خارجی کائنات کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے صرف کرتی ہے۔ اقبال نے نیابت الٰہی کی اصطلاح کو انہی معانی میں استعمال کیا ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ چونکہ اس اصطلاح کو اب غلط معانی پہنا کر اسے خصوصی مفاد کے لئے استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس لئے بہتر ہو کہ اسے استعمال ہی کیا جائے۔ تصوف کے حامی "نائب حق" سے مراد وہ "انسان کامل" لیتے ہیں جسے مرشد سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جو باطنی قوتوں کا حامل ہوتا ہے۔ حالانکہ قرآن سے نہ اس قسم کے انسانی مرشد کی سند ملتی ہے۔ نہ کسی باطنی قوت کی۔ دوسری طرف "مذہبی سیاست" کے مدعی اس نیابت کے تصور سے حقوق خداوندی (DIVINE RIGHTS) کے دعوے کی بنیاد پر تھیاکریسی (THEOCRACY) پیشوائیت کی حکومت قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ نہ رسول اللہؐ نے اپنے آپ کو خلیفۃ اللہ کہا اور نہ ہی حضورؐ کے جانشینوں نے اپنے لئے ایسا لقب تجویز کیا۔ انھوں نے اپنے آپ کو یا خلیفۃ الرسول (رسول اللہ کے جانشین) یا امیر المومنین کہہ کر پکارا۔ مومن، قرآن کا تجویز کردہ نام اور ان تمام خصوصیات کبریٰ کا حامل ہے جو شرف انسانیت کی آئینہ دار ہیں۔ اس لئے بہتر یہ ہے کہ نئی نئی اصطلاحات کے بجائے اسی قرآنی اصطلاح کو استعمال کیا جائے۔ علامہ اقبال نے بھی اپنے کلام میں مرد مومن کی اصطلاح بالعموم استعمال کی ہے۔ دو ایک مقام پر جہاں انھوں نے مومن کو نائب حق کہہ کر پکارا ہے۔ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ وہ دنیا میں قوانین خداوندی کو نافذ کرتا ہے۔

اس مفہوم کے پیش نظر ان اشعار کا مطلب سمجھئے جو مرحلہ سوم کے ضمن میں درج مثنوی ہیں۔ سابقہ مرحلہ (ضبط نفس) میں اقبال نے نفس انسانی کو شتر بے مہار سے تشبیہ دے کر یہ کہا ہے کہ انسان کو چاہیئے کہ بجائے اس کے کہ اس شتر کو آزاد چھوڑ دے اس سے آئین و قوانین کے تابع کام لے۔ اس کا نام شتربانی ہے یعنی نفس انسانی کو آئین خداوندی کی حدود کے اندر رکھنا اس کے بعد وہ کہتے ہیں۔

گر شتربانی، جہانبانی کنی
زیب سر تاج سلیمانی کنی

اگر تو اس قسم کا شتربان ہو گیا تو تو ساری کائنات پر حکمراں ہو جائے گا۔ اور اپنے سر پر تاج سلیمانی کو مزین دیکھے گا۔ قرآن نے واضح الفاظ میں بتلایا ہے کہ ایمان و اعمال صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض۔ دنیا کی حکومت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہنگامی طور پر قوت حاصل کر لینے سے بھی حکومتیں قائم ہو جاتی ہیں۔ لیکن ایک تو اس قسم کی حکومت اور اس حکومت کی غرض و غایت اور مقصود و مطلوب میں بُعد المشرقین، جو آئین خداوندی کے نفاذ کے لئے قائم ہوتی ہے۔ اور دوسرے یہ کہ جو حکومت ایمان و اعمالِ صالحہ کا نتیجہ ہو وہ زوال پذیر نہیں ہوتی۔ وہ اس وقت تک سرسبز و شاداب اور قائم و دائم رہتی ہے جب تک ایمان و اعمال صالحہ کا سلسلہ قائم رہتا ہے۔ قرآن میں ہے کہ ابلیس نے آدم کو یہ فریب دے کر بہکا دیا تھا کہ ھَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا يَبْلٰى (۲۰/۱۲۰)، میں تمہیں حیاتِ جاوید کا سراغ اور ایک ایسی مملکت کا پتہ نشان دیتا ہوں جو تغیر پذیر نہ ہو۔ اس کے لئے اس نے بتلایا کہ یہ چیز انسان کو اولاد کے ذریعے حاصل ہو گی بیٹے سے باپ کا نام قائم رہے گا۔ اولاد سے خاندان کا چراغ جلتا جائے گا۔ لیکن قرآن نے بتایا کہ یہ انسان کا فریب نفس ہے۔ حیات جاوید استحکام خودی سے حاصل ہوتی ہے۔ اور تغیرات سے محفوظ وہی مملکت رہ سکتی ہے جو ایمان و اعمالِ صالح کا نتیجہ ہو۔ یعنی مستقل اقدار کی صداقت پر یقین محکم اور ایسے کام جن سے انسانوں کی مضمر صلاحیتیں نشوونما پائیں۔ یہی وہ پروگرام ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

تاجہاں باشد جہاں آرا شوی
تاجدارِ ملکِ لایبلیٰ شوی

جب تک دنیا باقی ہے تو حکمران رہے گا۔ تجھے ایسی مملکت مل جائے گی جو دست بردِ زمانہ سے ہمیشہ محفوظ رہے گی۔

نائب حق در جہاں بودن خوش است
بر عناصر حکمراں بودن خوش است

بہترین زندگی مردِ مومن کی ہے جو فطرت کی تمام قوتوں کو مسخر کرتا ہے۔ اور پھر انہیں آئین خداوندی کے مطابق صرف کرتا ہے۔ جس سے انسانیت کی تعمیر ہوتی ہے۔ غور کیجئے کہ اقبال نے نائب حق کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ وہ عناصر پر حکمرانی کرتا ہے۔ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرتا ہے۔ اس نے اس کی کسی "باطنی قوت" کا ذکر نہیں کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ تصوف کی باطنیت اقبال کے الفاظ میں، اسلام میں اجنبی پودا ہے۔

نائب حق ہمچو جانِ عالم است
ہستیٔ او ظلِ اسمِ اعظم است

مردِ مومن کو اس مادی کائنات کی جان سمجھئے۔ اس جہانِ آب و گِل میں زندگی اسی کے دم سے ہے۔ اگر اس میں مردِ مومن نہ ہو تو یہ شجر و حجر کی دنیا، مٹی کے گھروندے سے زیادہ کچھ نہیں۔ مردِ مومن، دنیا میں سب سے بڑے نام، یعنی خدائے تعالےٰ کا سایہ ہے خدا کی صفات ابدی، غیر متبدل، مستقل بالذات اور لامحدود ہیں۔ انسانی ذات میں ان صفات کا پرتو، مثل عکس کے ہے اور وہ بھی بشریت کی حدود کے اندر۔ انکی ان صفات کو صفاتِ حقیقی کا سایہ سمجھئے۔ (اقبال کا اشارہ اس تصور کی طرف جس کی رو سے بادشاہ کو ظل اللہ علی الارض (زمین پر خدا کا سایہ)

کہا جاتا ہے۔ اس مردِ مومن کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ

از رموزِ جزو و کل آگہ بود
در جہاں قائم بامراللہ بود

اس کی ہستی کا قیام آئین خداوندی کے اتباع سے ہوتا ہے۔ اور اس کے علم کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ان تمام قوانین سے آگاہ ہوتا ہے جن کے مطابق بھی قوانین کی یہ عظیم کارگہ مصروفِ تگ و تاز ہے اسے قوانین فطرت کا پورا پورا علم ہوتا ہے۔ اور اسی علم کی بناء پر وہ اس پہلے مسالے (MATERIAL) سے نئی نئی چیزیں تخلیق کرتا رہتا ہے۔

خیمہ چوں در وسعتِ عالم زند
ایں بساطِ کہنہ را برہم زند

وہ جب اس وسیع و عریض کائنات کی پہنائیوں میں خیمہ زن ہوتا ہے تو اپنی ندرت کاریوں اور جدت طرازیوں سے کائنات کے قدیم نقشوں میں تغیر و تبدل سے اسے ایک جہانِ نو میں بدل دیتا ہے۔

فطرتش معمور و می خواہد نمود
عالمے دیگر بیارد در وجود

اس شعر میں حضرت علامہ نے ایک بہت بڑی حقیقت کو بیان کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ مردِ مومن سے یہ تخلیقی کارنامے سرزد کس طرح سے ہوتے ہیں؟ وہ کہتے ہیں کہ اس کی ذات گوناگوں صلاحیتوں سے بھرپور ہوتی ہے اور چونکہ ہر حقیقت (REALITY) اپنی نمود (MANIFESTATION) کے لئے بیتاب ہوتی ہے۔ اس لئے اس کی یہ مضمر صلاحیتیں ذوقِ نمود سے ابھرتی ہیں اور مادی پیکروں میں متشکل ہو کر سامنے آجاتی ہیں۔ انہی کو اس کے تخلیقی کارنامے کہا جاتا ہے۔ یعنی یہ خودی کی نمود کے مظاہر ہوتے ہیں۔

صد جہاں مثلِ جہانِ جزو و کل
روید از کشتِ خیالِ او چو گل

پہلے اس کی فکر کی دنیا ایک خاکہ مرتب کرتی ہے۔ اور پھر اس کے قوائے عملیہ اس خاکے میں رنگ بھر کر اسے خیال سے حقیقت بنا دیتے ہیں۔ اس طرح اس کے کشتِ خیال سے ہر آن ایک نئی دنیا وجود کوشش ہوتی چلی جاتی ہے لیکن وہ صرف اس خارجی کائنات میں ہی تخلیقی اضافے نہیں کرتا۔ وہ خود انسانوں کی دنیا میں بھی حسین و صالح تغیرات پیدا کرتا چلا جاتا ہے وہ مناسب تعلیم و تربیت سے

پختہ سازد فطرتِ ہر خام را
از حرم بیروں کند اصنام را

ہر فردِ انسانیہ کی خام فطرت میں پختگی پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے قلب و نگاہ سے باطل کے تصورات کو دور کر کے، ان کی جگہ ابدی حقائق کو دے دیتا ہے۔ یہ وہ کام ہے جو صرف ایک مردِ مومن ہی کر سکتا ہے۔ انسانیت سازی اس کی خصوصیت کبریٰ ہے۔

نغمہ زاتار دل از مضراب او
بہر حق بیداری او خواب او

اس کے مضراب سے دلوں کے اندر چھپے ہوئے نغمے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کی تربیت سے انسان کی مضمر صلاحیتیں ابھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ اس کا جاگنا بھی انسانیت کے تعمیری پروگرام کے لئے ہوتا ہے۔ اور اس کا سونا بھی اسی مقصد کے لئے تاکہ وہ اس سکون سے تازہ قوتیں اور نئی حرارتیں لے کر بیدار ہو اور اپنے پیش نظر پروگرام کی تکمیل میں پہلے سے بھی زیادہ سرگرم عمل۔

شیب را آموزد آہنگِ شباب
می دہد ہر چیز را رنگِ شباب

وہ بڑھاپے کو جوانی کے طور طریق سکھا دیتا ہے۔ وہ ہر شے کو رنگ شباب عطا کرتا ہے۔ اس کی رفاقت سے پست حوصلہ لوگوں کے دل میں تازہ ولولے بیدار ہو جاتے ہیں۔ اس کی مضمحل قوتیں حیات نو اختیار کر لیتی ہیں۔ اس کی نگاہوں سے ہر شے پر جوانی آجاتی ہے۔ اس کی مسکراہٹ سے کائنات کی ہر چیز حسین نظر آنے لگتی ہے۔

نوع انساں را بشیر و ہم نذیر
ہم سپاہی - ہم سپہ گر - ہم امیر

وہ ایسا نظام تشکیل کرتا ہے۔ جس میں نوع انسانی اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتی ہے کہ آئین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے نتائج کیسے شگفتہ و شاداب ہوتے ہیں۔ اور ان کی خلاف ورزی کے عواقب کیسے الم انگیز اور تباہ کن۔ وہ اس نظام کی حفاظت کرنے کے لئے جس سے درحقیقت مقصود خود نوع انسانی کی حفاظت ہوتی ہے۔ خود بطور سپاہی کام کرتا ہے۔ اپنے جیسے اور سپاہی تیار کرتا ہے اور اس جماعت کی قیادت بھی کرتا ہے۔ یہ کام سب سے پہلے خود رسولؐ کرتا ہے جس کی خودی انسانیت کے بلند ترین مقام پر ہوتی ہے اور جو کامل ترین مومن ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد یہی کام جماعت مومنین کے افراد کرتے ہیں۔ ان میں کا بہترین فرد ان کا امیر منتخب ہو جاتا ہے جو امت کو اسی راستے پر چلاتا ہے۔

مدعائے علم الاسما ستے
سرِّ سبحان الذی اسرا ستے

قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو کائنات کے تمام تصورات کا علم دے دیا۔ یعنی انسان میں قوانین فطرت معلوم کرنے کی صلاحیت رکھدی۔ مرد مومن اس آیۂ قرآنی کا مدعا ہے۔ یعنی مرد مومن تمام قوانینِ فطرت سے آگاہ رہتا ہے۔

قرآن میں دوسرے مقام پر ہے کہ اللہ کی ذات کس قدر بلند و برتر ہے جو اپنے بندے (رسول اللہ) کو رات کے وقت مسجد حرم (کعبہ) سے دور کی مسجد (مدینہ) کی طرف لے گیا۔ یہ شب ہجرت کا بیان ہے۔ ہجرت سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اگر ایک مرد مومن دیکھے کہ جس مقام پر اس نے اپنی دعوت کا آغاز کیا ہے وہ اس کی برومندی کے لئے ساعد نہیں تو وہ اس مقام کو چھوڑ کر ایسے مقام کی طرف

چلا جائے جسے وہ اس مقصد کے لئے زیادہ سازگار سمجھے اسے ہجرت کہتے ہیں۔ یہ مومن کامل کا مقام ہے۔ جس کے راستے میں وطن کی محبت کبھی عناں گیر نہیں ہوتی۔

از عصا دست سفیدش محکم است
قدرت کامل بعلمش توام است

پہلے مصرعہ میں حضرت موسےٰ کے عصا اور ید بیضا کی طرف اشارہ ہے لیکن اس سے حضرت علامہ نے استعارۃً ایک لطیف نکتہ پیدا کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مرد مومن کا ہاتھ بڑا پاکیزہ، صاف اور نورانی ہوتا ہے۔ یہ اس کی صفت جمالی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں جلالی صفات بھی ہوتی ہیں۔ جن سے اس کی جمالی صفات محکم ہوتی ہیں۔ عصا (قوت) اور ید بیضا (ہاتھ کی نورانیت، سیرت اور عمل کی پاکیزگی) دونوں کے امتزاج کا نام مومن ہے۔ اس کے ہاں قوت اور علم صحیح توام بچوں کی طرح دوش بدوش رہتے ہیں۔

چوں عناں گیرد بدست، آں شہسوار
تیز تر گردد سمند روزگار

جب وہ شاہسوار زمانہ کے اشہب عناں تاب کی لگام اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ تو اس کی برق رفتاری تیز سے تیز تر ہو جاتی ہے وہ مراحل جو انسانی معاشرے نے عام رفتار سے صدیوں میں طے کرنے تھے۔ اس کی قیادت میں چند دنوں میں طے ہو جاتے ہیں۔

خشک سازد ہیبت او نیل را
می برد از مصر اسرائیل را

اس کی ہیبت سے دریائے نیل خشک ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی قوم کو مستبد قوتوں کے پنجۂ آہنی سے چھڑا کر آزادی کی کھلی فضاؤں کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ تاکہ وہاں آئین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو سکیں۔

از قُم او خیزد اندر گور تن
مردہ جانہا چوں صنوبر در چمن

اس کا پیغام زندگی مردہ قوم میں حیات تازہ پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی آواز سے مردے اپنی اپنی قبروں سے اس طرح اٹھ کھڑے ہوتے ہیں جیسے باغ میں صنوبر کے قد آور درخت ایستادہ ہیں۔

ذات او توجیہہ ذات عالم است
از جلال او نجات عالم است

اس کی ذات سے وہ سمت متعین ہوتی ہے۔ جس کی طرف کاروان کائنات نے چلنا ہوتا ہے۔ دنیا اسی رخ کی طرف چلتی ہے جس طرف مرد مومن جا رہا ہو۔ اس کے جلال میں تمام نوع انسانی کی نجات کا راز مضمر ہوتا ہے۔ وہ اپنی قوتوں کو اس مقصد کے لئے صرف کرتا ہے کہ تمام افراد انسانیہ مستبد اور جابر حکمرانوں کے دست تظلم سے نجات حاصل کر کے آزادی کا سانس لے سکیں۔

لیکن یہ اس کے پروگرام کا حصہ آ ہوتا ہے۔ یہ اس کا منفی پہلو ہے۔ کمزوروں اور ناتوانوں کو بالا دست انسانوں کے پنجہ استبداد سے چھڑا دینا تخریبی پروگرام ہے۔ تعمیری پروگرام اس کے بعد شروع ہوتا ہے۔ جب ان کی مناسب تعلیم و تربیت سے وہ ان کے جوہر انسانیت میں جلا پیدا کرتا ہے۔ اور اس طرح کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ

ذرہ خورشید آشنا از سایہ اش
قیمتِ ہستی گراں از مایہ اش

اس کے سائے سے ہر ذرہ ناچیز خورشید بدوش ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح اس کی متاعِ خودی کے پرتو سے کائنات کی قیمت بڑھ جاتی ہے۔

زندگی بخشد ز اعجاز عمل
می کند تجدید انداز عمل

وہ ان انسانوں کو عمل کی ایک نئی پٹڑی پر ڈال دیتا ہے۔ اور صحیح اعمال کا اعجاز یہ ہے کہ وہ مردہ انسانوں کو زندگی عطا کر دیتے ہیں کاہن تو غلام اور محکوم بھی کرتا ہے۔ لیکن ان کے اعمال سے ان میں دن بدن زندگی کم ہوتی جاتی ہے۔ اس کے برعکس وہ ان آزاد انسانوں کو عمل کی ایک ایسی نئی راہ پر لگا دیتا ہے۔ جس سے ہر عمل ایک حیاتِ تازہ کا پیغام بر بن جاتا ہے۔

جلوہ ہا خیزد ز نقشِ پائے او
صد کلیم آوارہ سینائے او

اس کے نقوش پا کے ہر ذرے میں ہزاروں جلوے پوشیدہ ہوتے ہیں۔ وہ جس راستے پر چلتا ہے۔ اس کے نشانِ قدم آنے والوں کے لئے دلیل راہ بن جاتے ہیں۔ اور وہ جان لیتے ہیں کہ یہی راستہ انہیں منزلِ مقصود کی طرف لے جائے گا۔ وہ جن وادیوں میں پھرتا ہے۔ وہ اس طرح بقعۂ نور بن جاتی ہے کہ ان میں کئی جلوؤں کے تمنائی سراپا شوق دکھائی دیتے ہیں۔

زندگی را می کند تفسیر نو
می دہد ایں خواب را تعبیر نو

وہ کتاب زندگی کی نئی تفسیر پیش کرتا ہے۔ وہ انسانوں کے سامنے زندگی اور اس کے مقاصد کے ایسے معانی بیان کرتا ہے جن سے وہ اس سے قبل یکسر ناآشنا ہوتے ہیں۔ وہ اس خواب کی ایسی تعبیر بیان کرتا ہے۔ جس میں ہزاروں بیداریاں جلوہ فرما نظر آتی ہیں۔

ہستیٔ مکنونِ او رازِ حیات
نغمۂ نشنیدۂ سازِ حیات

بظاہر تو وہ عام انسانوں جیسا ہوتا ہے۔ لیکن اس کے سینے میں حقائق کی جو دنیا پنہاں ہوتی ہے۔ اس میں رازِ زندگی پوشیدہ ہوتا ہے یوں سمجھئے کہ وہ بربطِ ہستی کا ایسا نغمہ ہوتا ہے جسے اس سے پہلے کسی نے نہیں سنا ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی ہزاروں ارتقائی

منازل طے کرنے کے بعد کہیں ایسا پیکر اختیار کرتی ہے۔

طبعِ مضموں بند فطرت خوں شود
تا دو بیت ذاتِ او موزوں شود

جس طرح ایک نادر مصرعہ موزوں نہیں ہوتا جب تک خونِ دلِ شاعر کی رنگینی اس میں شامل نہ ہو۔ اسی طرح زندگی ایسے مردِ مومن کا پیکر اختیار نہیں کرتی جب تک خود فطرت کی طبیعت خون نہ ہو جائے۔

مشتِ خاک ما بسر گردوں رسید
زیں غبار آں شہسوار آید پدید

سوال یہ ہے کہ اس قسم کا مردِ مومن پیدا کس طرح سے ہوتا ہے؟ کیا یہ یونہی حادثاتی طور پر از خود وجود میں آجاتا ہے؟ فطین GENIUS کے متعلق علمائے نفسیات یہی کہتے ہیں کہ اس کی تخلیق سلسلۂ ارتقاء میں بالکل خارقِ عادت ہوتی ہے لیکن قرآن کہتا ہے کہ ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم۔ تم میں سے خدا کے نزدیک سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہوتا ہے جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اس قسم کا مردِ مومن ہر دور کی ملت کا گلِ سر سبد ہوتا ہے۔ جس سطح پر ملت ہوگی، اس سے ذرا ابھری ہوئی سطح پر ان کا امیر ہوگا۔ وہ انہی میں کا ایک فرد ہوتا ہے۔ آسمان سے بنا بنایا نہیں اترتا۔ اس قسم کے آنے والے کا تصور جو (ختمِ نبوت کے بعد) کہیں سے بنا بنایا آجائے، مجوسیت کا دیا ہوا تصور ہے۔ جو دنیا کے قریب قریب ہر مذہب میں پایا جاتا ہے۔ دنیا کی ہر مذہبی قوم اس قسم کے آنے والے کے انتظار میں بیٹھی ہے۔ قوم دن بدن پست سے پست تر حالت میں گرتی چلی جاتی ہے اور اس خیال میں مگن رہتی ہے کہ ہم میں سے ایک ایسا فرد آسمان سے آجائے گا، جو ہمیں ساری دنیا پر حاکم و غالب بنا کر ہماری پستیوں کو اوج میں تبدیل کر دے گا۔ بدقسمتی کہ، باقی اقوامِ عالم کی طرح، مسلمان بھی اسی طرح کے ایک آنے والے کے انتظار میں بیٹھے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ختمِ نبوت سے اس قسم کے آنیوالوں کا سلسلہ ہی ختم کر دیا۔ اب جس سطح پر قوم ہوگی، اسی سطح کا اس سے قدرا ابھرے گا۔ ہم اگر اپنی سطح کو بلند کر لیں گے (اور مسلمانوں میں قرآن کی موجودگی کی وجہ سے یہ صلاحیت اور امکان موجود ہے کہ یہ اپنے آپ کو اوجِ ثریا سے بھی اونچے لے جائیں) تو اس سے پھر ایسے مردِ مومن پیدا ہو جائیں گے، جو دجۂ نازشِ روزگار ہوں گے۔

مشتِ خاک ما بسر گردوں رسید
زیں غبار آں شہسوار آید پدید

جب ہماری مشتِ خاک بلند ہوتے ہوتے آسمان بوس ہو جائے گی تو اس غبار سے وہ شہسوار برآمد ہوگا۔ غور کیجئے کہ اس تصور نے مسلمان کو باقی اقوامِ عالم کے مقابلے میں کس طرح ایک امتیازی خصوصیت عطا کر دی۔ باقی قوموں کا عقیدہ یہ ہے کہ ہم میں یہ صلاحیت نہیں ہے کہ اپنے اندر سے کسی فردِ کامل کو پیدا کر سکیں۔ لیکن قرآن نے "آنے والے" کے تصور کو باطل قرار دے کر امتِ مسلمہ سے کہدیا کہ تم اپنے آپ کو اتنی بلندیوں تک لے جا سکتے ہو، جہاں سے تم میں ایسے افراد پیدا ہوں جو باقی قوموں کے نزدیک

صرف آسمان سے بنے بنائے اترتے ہیں۔ اسی تصور کے پیشِ نظر اقبال نے کہا ہے کہ

خفتہ در خاکسترِ امروزِ ما
شعلۂ فردائے عالم سوزِ ما

اس میں شبہ نہیں کہ ہم آج راکھ کا ڈھیر ہیں۔ لیکن ہماری خاکستر میں اس کے امکانات ہیں کہ اس سے وہ شعلہ پیدا ہو جائے جو باطل کے خس وخاشاک کو جلا کر خاکستر بنا دے۔

غنچۂ ما گلستاں در دامن است
چشمِ ما از صبحِ فردا روشن است

ہماری ملت کا ننھا سا غنچۂ ناشگفتہ اپنے اندر پورے کا پورا گلستان لئے بیٹھا ہے۔ ذرا سی مساعد فضا مل جائے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ غنچہ کس قدر بہار آفرینیوں کا موجب بنتا ہے۔ آج ہماری رات بے شک تاریک ہے۔ لیکن ہماری آنکھ اس نور سے روشن ہے جو ہمیں مستقبل میں نمودار ہونے والا ہے۔

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

یہ ہے اقبال کے نزدیک 'مہدی' کا تصور۔ یعنی جب امت کی اپنی سطح بلند ترین ہو جائے۔ تو اس کے منتخب افراد ان خصوصیات کے حامل ہوں گے۔

اس مقام پر پہنچ کر اقبال عالمِ تصور میں اس قسم کے مردِ مومن کو سامنے لاتا ہے جو ملت کے غبارِ فلک پیما سے پیدا ہوتا ہے۔ اس تصور اس قدر جذب و وجد کی کیفیت پیدا کرتا ہے کہ اقبال والہانہ طور پر پکار اٹھتا ہے کہ

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا
اے فروغِ دیدۂ امکاں بیا

اے وہ کہ زمانہ تیرا مرکب اور تو اس کا راکب ہے۔ ہم میں آ، اور ہمیں حیاتِ تازہ عطا کر دے۔ اے وہ جو اس عالمِ امکاں کی آنکھ میں نور و بصیرت کا موجب ہے۔ ہمارے لئے شمعِ محفل بن جا۔

واضح ہے کہ ان تصریحات کی روشنی میں جو سابقہ اشعار میں سامنے آچکی ہیں۔ ایسا سمجھنا قطعاً غلط ہوگا کہ اقبال کسی ایسے آنے والے کو پکار رہا ہے۔ جو اس وقت کہیں موجود ہے۔ اقبال جب خود ہی ابھی ابھی کہہ چکا ہے کہ وہ خود ملت کی بلندیٔ سطح کی تخلیق ہوگا۔ تو اس سے تصور اس طرف جانا ہی نہیں چاہیئے کہ اس کی مراد کسی بنے بنائے آنے والے سے ہے۔ بہرحال وہ اس مردِ مومن کے متعلق انتہائی ذوق و شوق سے کہتا ہے کہ

رونقِ ہنگامۂ ایجاد شو
در سوادِ دیدہ ہا آباد شو

آ اور اس خاموش کائنات میں آسمانی انقلاب کا ہنگامہ پیدا کر دے۔ کروڑوں آنکھیں تیری آمد کی منتظر ہیں۔ اور ان کی آنکھوں کی پتلیوں میں اپنا نشیمن بنا۔

شورشِ اقوام را خاموش کن
نغمۂ خود را بہشتِ گوش کن

اقوامِ عالم میں اس وقت عجیب انداز کی شورش برپا ہے۔ ہر طرف انتشار و اضطراب، ہر سمت چیخ و پکار اور آہ و بکا۔ تو آ۔ اور اس جہنمی شورش کو مبدل بہ تسکین کر دے اس اضطراب و خلفشار میں صرف تیرا ہی پیغام ایسا ہے جو اقوامِ عالم کے لئے فردوسِ گوش بن سکتا ہے۔

خیز و قانونِ اخوت ساز دہ
جامِ صہبائے محبت باز دہ

تو اٹھ اور گروہوں اور فرقوں میں بٹی ہوئی دنیا کو وہ قانون عطا کر جس سے تمام نوعِ انسانی ایک برادری کے رشتہ میں منسلک ہو جائے ان بہکے ہوئے انسانوں کو پھر سے وہی جامِ محبت پلا دے جس نے ایک مرتبہ خون ریز قبائل کو شیر و شکر کر دیا تھا۔

باز در عالم بیار ایامِ صلح
جنگجویاں را بدہ پیغامِ صلح

اس دنیا میں جہاں ہر قوم دوسری قوم کی تباہی کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہے۔ تو پھر وہ بہار آفریں فضا پیدا کر دے جس سے ہر سمت صلح و آشتی کی بساط بچھ جائے۔ اس قسم کی جنگجو قوموں میں مصالحت کرا دینا صرف اس قانون کی رو سے ممکن ہے۔ جس کا تو حامل ہو گا۔ ایسا صرف قرآن کے قانونِ ربوبیت سے ہو سکے گا۔

نوعِ انساں مزرع و تو حاصلی
کاروانِ زندگی را منزلی

تمام نوعِ انسان ایک کھیتی ہے۔ اور اس کھیتی کا ماحصل وہ مردِ مومن ہے جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ یہی مردِ مومن کاروانِ حیات کے لئے منزل ہے۔ انسانی زندگی کا مقصود و منتہیٰ یہ ہے کہ وہ اس قسم کے مردِ مومن کے پیکر میں ڈھل جائے۔

ریخت از جورِ خزاں برگِ شجر
چوں بہاراں بر ریاضِ ما گذر

ہمارا شجرِ ملت زوال و انحطاط کی خزاں سے بالکل بے برگ و بار ہو چکا ہے۔ تو بادِ بہاری کی طرح ہمارے اجڑے ہوئے گلستاں پر محوِ خرام ہو اور اسے پھر سے شگفتہ و شاداب چمنستاں میں تبدیل کر دے۔

سجدہ ہائے طفلک و برنا و پیر
از جبینِ شرمسارِ ما بگیر

قوم کے بچے۔ نوجوان۔ بوڑھے۔ عقیدت مندیوں کے ہزار سجدے اپنی پیشانیوں میں لئے تیرے انتظار میں ہمہ تن شوق ہیں۔ تو آ اور ہماری عرق آلود پیشانیوں سے ان سجدوں کو قبول کر۔

از وجود تو سرا فرازیم ما
پس بہ سوز ایں جہاں سازیم ما

ہماری تمام سرفرازیاں تیری ذات سے وابستہ ہیں۔ تو ایک دفعہ آ جا۔ اور پھر دیکھ کہ ہم کس طرح زمانہ کی تمام تلخیوں کو برداشت کر کے انھیں نوشابۂ شیریں بنا دیتے ہیں۔

* ہے وہ مردِ مومن جو اطاعتِ قوانینِ خداوندی سے اپنی ذات کا استحکام کرے۔

کیا آپ نے یہ کتابیں دیکھی ہیں؟

اقبال و قرآن از پرویز — علامہ اقبال کے قرآنی پیغام سے متعلق محترم پرویز صاحب کے انقلاب آفریں مقالات کا مجموعہ ۲۵۶ صفحات۔ قیمت دو روپے

سلیم کے نام از پرویز — نوجوانوں کے دل میں اسلام سے متعلق جو شکوک پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا شگفتہ اور مدلل جواب بڑے سائز کے ۴۰۰ صفحات۔ قیمت چھ روپے

فردوسِ گم گشتہ از پرویز — ان مضامین کا مجموعہ جنھوں نے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی نگاہ کا زاویہ بدل دیا ہے خالص ادبی نقطۂ نظر سے بھی اردو لٹریچر کی بلند پایہ تصنیف ۲۱۶ صفحات بڑا سائز قیمت چھ روپے۔

جشن نامے — ایسے عنوانات جنھیں پڑھ کر ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی ہو اور آنکھوں میں آنسو۔ طنز اور تنقید کے گہرے نشتر۔ سات سالہ دورِ آزادی کی بہتی ہوئی تاریخ۔ ۲۵۶ صفحات۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے

مزاجِ شناسِ رسولؐ — یہ کون بتلائے کہ صحیح احادیث کونسی ہیں اور غلط کونسی؟ مزاج شناس رسول۔ مزاج شناس رسول کون ہیں؟ اس کی تفصیل اس کتاب میں ملے گی۔ قیمت چار روپے۔

محصول ڈاک ہر حالت میں بذمہ خریدار ہوگا

ملنے کا پتہ:۔ ناظم ادارہ طلوع اسلام ۱۵۹/۳ ۔ ایل۔ پی۔ ای۔ سی۔ ایچ سوسائٹی کراچی ۲۹

سلسلۂ اصلاح وتذکیر

(محترم عمر احمد صاحب عثمانی)

قرآنی معاشرہ

باہمی تعلقات کے متعلق قرآن کی تعلیم

۳

[اس مضمون کی گذشتہ دو اقساط میں یہ بتایا جاچکا ہے کہ اولاد کو اپنے والدین کے ساتھ اور والدین کو اپنی اولاد کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں والدین کے واجبات کا بیان ہنوز جاری ہے۔ موجودہ قسط میں والدین کی ذمہ داریوں پر مزید روشنی ڈالی جارہی ہے۔]

اولاد

قتلِ اولاد کا مفہوم

قتل اولاد سے متعلق ہمیں قرآن کریم میں دو طرح کی آیات ملتی ہیں۔ ایک تو وہ آیات ہیں جن میں لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ کے الفاظ کے ساتھ اولاد کشی سے منع کیا گیا ہے۔ اس موضوع کی مختلف آیتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جرم فاقہ کشی اور تنگدستی کے خوف کے ماتحت کیا جاتا تھا۔ اور عربوں میں اس قدر عام تھا کہ رسول اللہ صلعم کو ہدایت فرمائی گئی تھی کہ جو مومن عورتیں بھی آپ سے بیعت کرنے آئیں آپ ان سے یہ عہد بھی لیا کریں کہ وہ نسل کشی کے جرم کی مرتکب نہیں ہونگی پھر ساتھ ہی قرآن کریم یہ بھی بتا دیتا ہے کہ یہ جرم اکثر مشرکین میں پھیلا ہوا تھا۔ اور ان کے مراکزِ اطاعت (شرکاء) نے اس جرم کو ان کی نگاہوں میں بڑا ہی خوش آئند بنا رکھا تھا۔ جس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ عربوں کو تباہ و برباد کردیں۔ اور ان کے دین کو ان کے لئے مشتبہ بنادیں۔ ان آیات سے جہاں ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ جرم عربوں میں بہت ہی عام تھا۔ وہیں ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے محرکات کیا تھے۔ عام لوگ فاقہ کشی اور تنگدستی کے خطرے کے ماتحت اس کا ارتکاب کرتے تھے۔ اور ان کے دینی پیشوا ان کے سامنے اس جرم کو حسین بنا کر پیش کرتے تھے جس سے ان کا مقصد عربوں کی تباہی اور بربادی اور دین کے بارے میں التباس و اشتباہ پیدا کرنا ہوتا تھا۔ اس

کے بالمقابل قرآن کریم کی وہ دوسری آیات ہیں جن میں (عام اولاد نہیں بلکہ) خصوصیت کے ساتھ لڑکیوں کو قتل کر دینے یا زندہ درگور کر دینے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس شنیع جرم کا محرک وہ ذلت و رسوائی کا احساس ہوتا تھا جو ایک عرب کو سوسائٹی میں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑتا تھا۔ اگر کسی کے ہاں لڑکی پیدا ہو جاتی تھی تو وہ اس دوگونہ مصیبت میں پھنس جاتا تھا کہ آیا اس ذلت کو برداشت کرے یا اس لڑکی کو مٹی میں دبا کر اس رسوائی سے چھٹکارا حاصل کرے۔ کچھ لوگ اس ذلت کو برداشت کر لیتے تھے اور کچھ سنگدل ایسے بھی ہوتے تھے جو اپنی لڑکیوں کو زمین میں زندہ گاڑ دیا کرتے تھے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ لڑکیوں کو زندہ درگور کر دینے کا عام رواج عام عربوں میں نہیں پایا جاتا تھا۔ بلکہ چند خاندانوں (یعنی ربیعہ اور مُضر کی چند شاخوں میں) پایا جاتا تھا[1]۔ اور وہ بھی نہایت کمی کے ساتھ تھا۔ یہ جرم اگر عربوں میں اتنا عام ہوتا۔ جتنا قتل اولاد کی آیات سے نظر آتا ہے تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ عرب میں عورتوں کی تعداد اتنی ہو سکے گی کہ ایک ایک مرد کے گھر میں دس دس بارہ بارہ بیویاں ہوتی ہوں۔ حالانکہ اسلام سے پہلے عربوں کی معاشرت میں بیویوں کی یہ کثرت تاریخ کے مسلمات میں سے ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر سارے عرب میں دختر کشی کی یہ رسم اس قدر عام تھی تو ان کے گھروں میں اتنی کثرت سے بیویاں کہاں سے آجاتی تھیں۔ اس کے علاوہ دختر کشی کی رسم کا محرک جذبہ جیسا کہ خود قرآن کریم اور تاریخ سے واضح ہے۔ فقر و فاقہ کا خوف نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ ذلت اور رسوائی کا احساس ہوتا تھا۔

ان حقائق کے پیش نظر میرا خیال یہ ہے کہ پہلی قسم کی آیات میں قتل اولاد سے مراد دختر کشی کی رسم نہیں ہے۔ بلکہ فکری اور اخلاقی طور پر ان کو مار ڈالنا ہے۔ اور دوسری قسم کی آیات میں دختر کشی کی رسم مراد ہے۔

چنانچہ قتل اولاد سے متعلق قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ

قَدْ خَسِرَ الَّذِينَ قَتَلُوا أَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَحَرَّمُوا مَا رَزَقَهُمُ اللَّهُ افْتِرَاءً عَلَى اللَّهِ ۚ قَدْ ضَلُّوا وَمَا كَانُوا مُهْتَدِينَ ﴿۱۴۰﴾ (۶)

وہ لوگ انتہائی خسارہ میں رہے جو اپنی اولاد کو محض اپنی بیوقوفی اور جہالت کی وجہ سے قتل کر ڈالتے ہیں۔ اور جو کچھ خدا انہیں عطا فرماتا ہے۔ اسے خدا کے ذمہ تہمتیں باندھ کر اپنے اوپر حرام کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ صحیح راستہ سے بھٹک گئے ہیں اور یقیناً درست راستہ پر نہیں چل رہے ہیں۔

یہ لوگ اپنی بیوقوفی اور جہالت سے اخلاقی طور پر اپنی اولاد کو یوں ختم کر دیتے تھے کہ ان کی صلاحیتیں پروان نہیں چڑھتی تھیں وہ اس طرح دب کر رہ جاتی تھیں کہ ان کے پھلنے پھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ زندگی کی دوڑ میں آگے قدم بڑھانے کے قابل ہی نہیں بنتے تھے۔ اسی کو قرآن کریم نے دوسری جگہ ان الفاظ میں ادا کیا ہے۔

---

[1] ملاحظہ ہو تفسیر المنار ص ۱۴۳ ج ۸۔

قُلۡ تَعَالَوۡا اَتۡلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمۡ عَلَيۡكُمۡ اَلَّا تُشۡرِكُوۡا بِهٖ شَيۡـًٔـا وَّبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا ۚ وَلَا تَقۡتُلُوۡۤا اَوۡلَادَكُمۡ مِّنۡ اِمۡلَاقٍ ؕ نَحۡنُ نَرۡزُقُكُمۡ وَاِيَّاهُمۡ .... (۶/۱۵۲)

اے پیغمبر اسلام کہدو! کہ آؤ میں تمہیں پڑھ کر سناؤں۔ خدا نے تم نے پر کیا کیا چیزیں حرام کی ہیں۔ ایک تو یہ کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹہراؤ۔ اور والدین کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ اور فقر و فاقہ کے اندیشہ سے اولاد کو قتل نہ کرو۔ ہم ہی تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور انہیں بھی۔

اس آیت میں قرآن کریم نے یہ بھی وضاحت کر دی ہے کہ نسل کشی کے اس جرم کا ارتکاب عربوں میں فقر و فاقہ کے اندیشہ کی وجہ سے کیا جاتا تھا جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں وہ اولاد کو فروخت کر دیا کرتے تھے۔ اور ضرورت پڑنے پر سرمایہ داروں کے ہاں رہن بھی رکھ دیا کرتے تھے۔ بہر حال اس نسل کشی کا ارتکاب اس روایتی شرم اور عار کی وجہ سے نہیں ہوتا تھا جو وہ لڑکیوں کے سلسلہ میں محسوس کرتے تھے۔ اگر آیات میں نسل کشی کے جرم کے ارتکاب سے یہ معنی لئے جائیں کہ اپنی اولاد کو سچ مچ قتل نہ کر دیا کرو تو یہ واقعہ کے خلاف ہوگا۔ کیونکہ جہاں تک ہمیں معلوم ہے فقر و فاقہ کے اندیشہ سے اپنے بچوں کو سچ مچ کوئی بھی ذبح نہیں کرتا تھا۔ لڑکیوں کو بھی زندہ درگور کیا جاتا تھا تو وہ اپنی روایتی شرم اور عار کے احساس کے ماتحت کیا جاتا تھا۔ فقر و فاقہ کے اندیشہ سے نہیں کیا جاتا تھا۔ بہر حال اس قسم کی آیات میں نسل کشی سے مراد صرف دختر کشی کی وہ رسم نہیں۔ جو اس قدر عام تھی جو قرآن کے انداز بیان سے نظر آتی ہے۔ اور نہ ہی فقر و فاقہ کے اندیشہ کے ماتحت وقوع پذیر ہوتی تھی۔ اور اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ عربوں میں ایسا بھی کوئی رواج ہوگا کہ وہ فقر و فاقہ کے اندیشہ سے اولاد کو سچ مچ ذبح کر دیا کرتے ہوں تب بھی قتل اولاد کے عموم میں نسل کشی کی یہ معنوی صورت بھی داخل ہے کہ اولاد کی اخلاقی تربیت سے لاپرواہی برتی جائے۔ اور اسے یوں ان گڑھ چھوڑ دیا جائے۔ یا اس کی ایسی غلط تربیت کی جائے کہ وہ بالکل ہی ناکارہ ہو کر رہ جائے۔ انسان کا بچہ اگر حیوان بن جائے کہ اس میں انسانیت کی کوئی بات ہی پیدا نہ ہو تو یہ انسانیت کشی نہیں کہلائے گی تو اور کیا کہلائے گی۔ دوسری جگہ ہے۔

وَلَا تَقۡتُلُوۡۤا اَوۡلَادَكُمۡ خَشۡيَةَ اِمۡلَاقٍ ؕ نَحۡنُ نَرۡزُقُهُمۡ وَاِيَّاكُمۡ ؕ اِنَّ قَتۡلَهُمۡ كَانَ خِطۡاً كَبِيۡرًا ۝ (۱۷/۳۱)

اپنی اولاد کو فقر و فاقہ کے اندیشہ سے قتل نہ کر دیا کرو۔ ہم ہی انہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہیں بھی بلاشبہ اولاد کو یوں قتل کر ڈالنا بہت ہی بڑی خطا ہے۔

نسل کشی کی یہ رسم کہ اخلاقی طور پر اولاد کو بالکل ناکارہ کر کے ختم کر دیا جائے۔ ربیعہ اور مضر ہی میں نہیں تھی بلکہ عربوں میں اس قدر عام تھی کہ زیادہ تر مشرکین اس میں گرفتار تھے۔

وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ۝ (۶/۱۳۸)

اس طرح بہت سے مشرکین کی نگاہوں میں ان کے شرکاء نے قتل اولاد کے عمل کو خوشنما بنا رکھا ہے تاکہ وہ انھیں تباہی کے غار میں دھکیل دیں اور اس طرح ان کے دین کو ان پر مشتبہ کر دیں۔ اگر خدا چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے۔ لے پیغمبر آپ انھیں اور ان کی افترا پردازیوں کو چھوڑ دیجئے۔

اس آیت نے قتل اولاد کے مفہوم کو اور بھی واضح کر دیا ہے۔ کیونکہ یہاں بتایا گیا ہے کہ عرب مشرکین میں قتل اولاد کا یہ عمل بہت خوشنما کام سمجھا جاتا تھا۔ ان کے شرکاء نے ان کی نگاہوں میں اس عمل کو خوشنما بنا رکھا تھا جس سے ان کے دو مقصد تھے۔ پہلا مقصد تو یہ تھا کہ وہ انھیں تباہی کے غار میں دھکیل دیں اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ ان کے دین کو ان پر مشتبہ کر دیں۔ ان دونوں مقصدوں پر غور کرنے سے بات نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔ فی الواقع اولاد کو ذبح کر دینے سے تباہی تو آسکتی ہے۔ مگر اس سے دین میں کوئی اشتباہ یا التباس پیدا نہیں ہوتا۔ بچوں کو قتل کر دیا، وہ ختم ہو گئے۔ اب وہ دین میں التباس یا اشتباہ پیدا کرنے کہاں سے آئیں گے۔ دین تو دین۔ اب وہ زندگی میں بھی کوئی اشتباہ یا التباس پیدا نہیں کر سکتے۔ ان کا قتل دین میں التباس یا اشتباہ پیدا کرنے کا سبب تو جب ہی بن سکتا ہے کہ ان کو مادی طور پر زندہ تصور کیا جائے اور اخلاقی طور پر مردہ تسلیم کیا جائے۔ غلط تربیت کی وجہ سے اولاد ایسی صورتیں پیدا کر دیتی ہے کہ والدین شکل میں پھنس جاتے ہیں نہ اولاد کا ساتھ دیتے بن پڑتی ہے نہ اس کو چھوڑتے بن پڑتی ہے۔ ایک طرف مامتا ستاتی ہے تو دوسری طرف دین کے تقاضے مجبور کرتے ہیں بلکہ عموماً دین کے تقاضوں کی طرف تو نگاہ بھی نہیں جاتی۔ عقل حیلہ جو اولاد کی حمایت کے جذبے کے لئے ہزار حیلے بہانے تراشتی اور مذہباً اسے جائز قرار دیتی ہے۔

ذرا غور کیجئے آپ کا بیٹا لاپرواہی سے موٹر چلاتا ہے اور کسی بچے کی جان لے لیتا ہے۔ آپ کو اس کی اطلاع ملتی ہے تو آپ کا ردعمل کیا ہوتا ہے۔ آپ کا ردعمل یہی ہوتا ہے کہ آپ راہ گیروں کو گالیاں دینا شروع کر دیتے ہیں۔ پبلک کو ٹریفک کا شعور ہی نہیں رہا صاحب اندھے اور بہرے ہو کر چلتے ہیں۔ ہارن پر ہارن دیئے جائیے مجال ہے جو کان پر جوں رینگ جائے یا ادھر سے یا ادھر ہو جائیں۔ جب چلیں گے تو بیچ سڑک پر چلیں گے۔ اتنا نہیں ہوتا کہ دائیں بائیں ہٹ کر چلیں۔ گورنمنٹ بھی اندھی ہے کہ پبلک کو کچھ نہیں کہتی۔ موٹر چلانے والوں کو الٹا پکڑتی پھرتی ہے۔ وغیرہ ذٰلک۔ بہرحال عقل حیلہ جو کا تو کام ہی یہ ہے کہ وہ آپ کے جذبات کے تقاضوں کے لئے دلائل مہیا کرتی رہے۔ یہی صورت ہو تو کسے یہ خیال بھی کہاں آسکتا ہے کہ فلاں معاملہ میں اگر میں ایسا کروں گا تو اس سے دین کی خلاف ورزی ہو جائے گی۔

بہرحال دین میں التباس و اشتباہ اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے۔ جب آپ کی اولاد موجود ہو۔ اور آپ نے اس کی صحیح تربیت نہ کی ہو اور آئے دن وہ ایسے کام کرتی رہتی ہو جن سے آپ مخمصہ میں پڑ جاتے ہوں اور آپ کی ساری دین داری مشتبہ ہو جاتی ہو۔ پھر اولاد کی یہ محبت اور طرفداری ایک ایسا عمل ہے جو ہر ماں اور باپ کے نزدیک خوشنما ترین عمل ہوتا ہے۔ بچوں کا لاڈ اور پیار۔ اور لاڈ اور پیار میں ان کو بگاڑ نا کس

ماں اور کس باپ کے نزدیک خوشنما عمل نہیں ہوتا۔ لہذا ان آیات میں بظاہر قتلِ اولاد سے مراد، اولاد کو اخلاقی طور پر مار دینا اور ختم کر دینا ہی ہے۔ یعنی نظری اور فکری طور پر انھیں موت کی گہری نیند سلا دینا۔ لیکن اگر کسی کو پھر بھی اصرار ہو کہ قتل اولاد سے مراد سچ مچ بچوں کو ذبح کر دینا ہی ہے۔ تو ہمیں اپنے مفہوم پر اصرار نہیں ہے۔ البتہ اس صورت میں ہم یہ ضرور کہیں گے کہ ان آیات کے مفہوم میں اولاد کو اس طرح معنوی طور پر مار دینا بھی داخل ہے۔

عربوں میں یہ جرم اس قدر عام تھا کہ جو عورتیں رسول اللہ صلعم سے بیعت کرنے کے لئے آتیں تھیں ان سب سے یہ عہد لیا جاتا تھا کہ وہ اولاد کو قتل کرنے کی مرتکب نہیں ہوں گی۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا جَاءَكَ الْمُؤْمِنَاتُ يُبَايِعْنَكَ عَلَىٰ أَن لَّا يُشْرِكْنَ
بِاللَّهِ وَلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِينَ وَلَا يَقْتُلْنَ أَوْلَادَهُنَّ ..... (۶۰/۱۲)

اے نبی! جب تمہارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لئے آئیں تو وہ ان باتوں پر بیعت کریں کہ خدا کے ساتھ وہ کسی ہستی کو شریک نہیں ٹھرائیں گی۔ چوری نہیں کریں گی۔ زنا نہیں کریں گی۔ اور اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی۔

قرآن کریم جس شدتِ تکرار اور عمومیت کے ساتھ اس جرم کا تذکرہ کر رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف ربیعہ اور مُضر کی چند شاخوں کی بات نہیں بلکہ یہ کوئی ایسا جرم ہے جو عام طور پر عربوں میں رائج تھا۔ اس سے صاف نظر آتا ہے کہ مذکورہ بالا آیات میں قتل اولاد سے مراد بچوں کو واقعی ذبح کر دینا نہیں ہے۔ بلکہ فکری، نظری اور اخلاقی طور پر ان کو مار ڈالنا ہے کہ اس طرح پر بچوں کو مار ڈالنا بھی کوئی کم جرم نہیں ہے۔ اس سے پوری انسانیت تباہ ہو جاتی ہے۔ معاشرے میں چند بچے بھی ایسے پیدا ہو جائیں تو وہ پوری سوسائٹی کے لئے وبالِ جان بن جاتے ہیں۔ پوری نئی پود ان کے اعمال و کردار سے متاثر ہوتی ہے۔ آپ اپنے بچوں کو کتنی ہی صحیح تربیت دیں۔ لیکن اگر محلے میں چند شریر اور بداخلاق بچے بھی موجود ہیں تو آپ کی صحیح تربیت آپکے بچوں پر وہ اثر نہیں کر سکیگی جو محلے کے ان چند بچوں کے اثرات کام کر جائیں گے۔ یہ انفرادی جرم نہیں بلکہ آہستہ آہستہ یہ اجتماعی جرم بن جاتا ہے۔ مثل مشہور ہے کہ خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔ خربوزوں کے متعلق یہ بات صحیح ہو یا نہ ہو مگر بچوں کے متعلق یہ اصول حرف بحرف صحیح ہے۔ اس لئے آپ اگر اپنے بچوں کی صحیح تربیت نہیں کرتے تو اتنا ہی نہیں کہ آپ اپنے بچوں کی زندگی خراب کرتے ہیں بلکہ بالواسطہ آپ پوری سوسائٹی کے بچوں کی زندگیاں خراب کر دیتے ہیں

یہیں سے یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ معاشرہ میں اگر کچھ بچے بداخلاق اور بدکردار اٹھ رہے ہیں تو آپ کو یہ سوچ کر مطمئن نہیں ہو جانا چاہیئے کہ اس کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہوتی یہ ان کے ماں باپ کا فریضہ ہے کہ وہ ان کی دیکھ بھال کریں۔ کیونکہ ان کی بدکرداری اور بداخلاقی ایک متعدی مرض ہے جس سے آپکے اور آپ کی سوسائٹی کے سارے بچے متاثر ہوتے ہیں۔ اس لئے اس سلسلہ میں اغماض یا چشم پوشی نہیں برتنی چاہیئے۔ ایسے بچوں کے والدین کو متنبہ کرنا اور خود ان بچوں کو تنبیہ کرنا ضروری ہے۔ مگر تنبیہ کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ آپ ان سے لڑنے جھگڑنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ بلکہ تنبیہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح آپ اپنے بچوں کو تنبیہ کرتے ہیں۔ اسی طرح آپ ان کو بھی

تنبیہ کریں۔ اور ان کے والدین کو سمجھائیں کہ وہ بھی ان کی صحیح تربیت کی طرف توجہ دیں۔

لڑکیاں باعثِ عار نہیں

اولاد کے متعلق سطور بالا میں آپ دیکھ چکے ہیں۔ کہ خدا نے انھیں اپنی نعمت، رحمت اور حیاتِ دنیوی کی زینت قرار دیا ہے۔ اولاد میں لڑکے بھی شامل ہیں اور لڑکیاں بھی۔ لڑکے پیدا ہونے پر خوشی منانا اور لڑکی پیدا ہونے پر سوگ من جانا یہ وہ جہالت ہے جس کا قرآنی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ عورت اور مرد دونوں اپنی اپنی جگہ پر اپنی اہمیت رکھتے ہیں۔ زندگی کی گاڑی نہ مرد تنہا کھینچ سکتا ہے۔ نہ عورت تنہا کھینچ سکتی ہے۔ زندگی کے تقاضے کچھ اس قسم کے ہیں کہ نہ تنہا مرد ان کو پورا کر سکتا ہے نہ تنہا عورت انھیں پورا کر سکتی ہے یہ دونوں مل کر ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے عورت اور مرد کے تعلق کو ان الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (۲/۱۸۷)

عورتیں تمہارا لباس ہیں۔ اور تم ان کا لباس ہو

لباس کا ایک کام یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ جسم کے نقائص اور عیوب کو ڈھانپ لیتا ہے۔ اسی طرح مرد اور عورت ایک دوسرے کے نقائص کو ڈھانپ لیتے ہیں۔ اور اس طرح ایک دوسرے کی تکمیل اور حفاظت کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے حقوق کے معاملہ میں مرد اور عورت میں فرق نہیں کیا۔

وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ...... (۲/۲۲۸)

مردوں کے ذمہ عورتوں کے بھی ویسے ہی حقوق ہیں جیسے عورتوں کے ذمہ مردوں کے حقوق ہوتے ہیں جانے پہچانے طریقہ پر۔

اولاد خدا کے قانون کے مطابق ملتی ہے۔ کسی کو لڑکے ہی لڑکے ملتے ہیں اور کسی کو لڑکیاں ہی لڑکیاں ملتی ہیں۔ کچھ ایسے ہوتے ہیں جن کے ہاں لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہوتے ہیں اور کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ان کے ہاں نہ لڑکے پیدا ہوتے ہیں اور نہ لڑکیاں ہوتی ہیں۔ اس میں کچھ انسان کی اپنی ہنرمندی کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس لئے اگر کسی کے ہاں لڑکے ہی لڑکے پیدا ہوتے ہیں تو اس پر اسے گھمنڈ کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اگر کسی کے ہاں لڑکیاں ہی لڑکیاں پیدا ہوتی ہیں تو اسے قطعاً کبیدہ خاطر ہونے کی یا شرم اور عار محسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔ حتیٰ کہ اگر کسی کے ہاں اولاد ہی نہیں ہوتی تو اس میں بھی شرمانے یا رنجیدہ ہونے کی کوئی بات نہیں۔

لِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ۚ يَهَبُ لِمَن يَشَاءُ إِنَاثًا وَيَهَبُ لِمَن يَشَاءُ الذُّكُورَ ۝ أَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَإِنَاثًا ۖ وَيَجْعَلُ مَن يَشَاءُ عَقِيمًا ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ قَدِيرٌ ۝ (۴۲/۴۹-۵۰)

بلندیوں اور پستیوں کی حکومت خدا ہی کے لئے ہے۔ وہ نئی نئی ترکیبیں دے کر جو چاہتا ہے۔ پیدا کرتا رہتا ہے جسے اس کا قانون کا تقاضا ہو ہے لڑکیاں ہی لڑکیاں دے دیتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے

(اپنے قانون کے مطابق) لڑکے ہی لڑکے دیدیتا ہے۔ یا ان کو جوڑ جوڑ کر دیتا ہے۔ یعنی لڑکے اور لڑکیاں دونوں پیدا کر دیتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے بانجھ بنا دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا خوب جانتا ہے اور ہر چیز کے لئے اس نے پیمانے مقرر کر رکھے ہیں۔

خدا کے "قانون" کے مطابق ملنے سے یہ مراد نہیں کہ یہ باتیں انسان کی تقدیر میں پہلے سے لکھی ہوتی ہیں جنھیں کوئی بدل نہیں سکتا۔ خدا کے قوانین میں "طبعی قوانین" بھی شامل ہیں۔ اولاد کی پیدائش اس کے طبعی قوانین کے مطابق ہوتی ہے۔ جن کا مطالعہ کر کے ان کی بابت علم حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر ان کی رو سے دیکھا جائے کہ کسی مقام پر کوئی طبعی نقص پایا گیا ہے۔ تو اس کا علاج بھی کیا جاسکتا ہے۔ قرآن کریم اس آیت میں جس نقطہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ لڑکے یا لڑکی میں کوئی امتیاز نہیں کہ لڑکا خدا کی نعمت ہے اور لڑکی اس کا عذاب۔ یہ غلط ہے۔ لہٰذا جسے لڑکیاں ملتی ہیں اسے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ اور جسے لڑکے ملتے ہیں اسے بھی خدا کا سپاس گذار ہونا چاہیئے۔ بلکہ بعض لڑکیاں ایسی ہوتی ہیں جو ہزار لڑکوں پر بھاری ہوتی ہیں۔ اور بعض لڑکے ایسے ہوتے ہیں جو ماں باپ کی زندگی کے لئے وبالِ جان بن جاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت مریمؑ کے متعلق قرآن کی شہادت ہے کہ

إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنثَىٰ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنثَىٰ ۖ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ ...... ($\frac{3}{35-36}$)

یاد کرو جب عمران کی بیوی نے عرض کیا۔ اے میرے پروردگار! میں تیرے لئے نذر مانتی ہوں کہ جو کچھ میرے پیٹ میں ہے وہ تیرے لئے آزاد کر کے چھوڑ دوں گی۔ تو اسے مجھ سے قبول فرما لے۔ بلاشبہ تو سننے والا اور جاننے والا ہے۔ جب عمران کی بیوی کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی تو وہ کہنے لگی۔ پروردگار! میرے تو بچی ہوئی ہے۔ اور خدا خوب جانتا تھا کہ اس کے ہاں کیا پیدا ہوا ہے۔ اور یہ بھی کہ لڑکا اس لڑکی کے برابر نہیں ہو سکتا۔ عمران کی بیوی نے کہا۔ میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے۔

آپ نے دیکھ لیا کہ قرآن نے خود یہ شہادت دی ہے کہ اگر عمران کی بیوی کے لڑکا پیدا ہوتا تو وہ اس لڑکی کے برابر نہیں ہوسکتا تھا کون نہیں جانتا کہ یہ لڑکی اور اس لڑکی کا بیٹا ہی تو تھا جس نے دنیا میں اتنا بڑا انقلاب پیدا کر دیا۔ اور بالآخر دنیا بھر کے لئے خدا کی نشانی (آیَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ) قرار پا گئے۔

لیکن اس کے برعکس ایسے لڑکے بھی ہوتے ہیں۔ جن کے جرائم ان سے آگے بڑھ کر ان کے ماں باپ کے لئے بھی تباہی کا موجب بن سکتے ہیں۔ سورۂ کہف میں ہے کہ صاحب موسےٰ نے جب ایک لڑکے کو قتل کر دیا۔ اور موسیٰ علیہ السلام نے اعتراض کیا کہ آپ نے بلا وجہ ایک ہونہار جان کو کیوں قتل کر دیا۔ یہ کام تو آپ نے بہت برا کیا تو اس پر انھوں نے موسیٰ علیہ السلام کو بتایا تھا کہ

وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۝
فَاَرَدْنَآ اَنْ يُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَيْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّاَقْرَبَ رُحْمًا (۱۸/۸۱-۸۰)

رہا وہ لڑکا تو اس کے ماں باپ مؤمن تھے۔ ہمیں اندیشہ تھا کہ یہ لڑکا ماں باپ کو سرکشی اور کفر پر مجبور کرے گا۔ لہٰذا ہم نے چاہا کہ خدا اس کی جگہ انھیں کوئی دوسری اولاد عطا فرمائے جو نشوونما میں اس سے بہتر اور صلۂ رحمی میں اس سے قریب تر ہو۔

لہٰذا قرآن کی رو سے نہ لڑکے کچھ زیادہ فضیلت کے مالک ہوتے ہیں۔ اور نہ لڑکیاں کچھ کوتاہ دست ہوتی ہیں۔ خدا کے قانون کے مطابق جو بھی اپنی صلاحیتوں سے صحیح کام لیتا ہے۔ وہ انسانیت کے لئے سودمند بن سکتا ہے لہٰذا لڑکوں اور لڑکیوں میں اس قسم کی کوئی تفریق کرنا کہ لڑکوں کی پیدائش پر خوشی منائی جائے اور لڑکیوں کی پیدائش پر سوگ قطعاً غیر قرآنی نظریہ ہے۔ صرف غیر قرآنی ہی نہیں بلکہ خلاف قرآن ہے۔

وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ۝ يَتَوَارٰى
مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ۭ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰي هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِي التُّرَابِ ۭ
اَلَا سَاۗءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝ (۱۶/۵۹-۵۸)

جب ان میں سے کسی کو یہ خوشخبری دی جاتی ہے کہ اس کے لڑکی پیدا ہوئی ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ اندر ہی اندر گھٹتا رہتا ہے اس بری خبر کی وجہ سے جو اسے سنائی گئی ہے۔ وہ لوگوں سے چھپا پھرتا ہے کیا اس ذلت و رسوائی کے باوجود وہ اسے رکھے یا مٹی میں دبا ڈالے۔ اف! کتنا برا فیصلہ ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

بڑے افسوس کا مقام ہے کہ آج مسلمانوں کے کچھ خاندانوں میں بھی اسی قسم کا نظریہ پایا جاتا ہے۔ لڑکی کی پیدائش کو بدشگونی سمجھا جاتا ہے کہتے ہیں کہ لیجئے صاحب ہمارے خلاف تو ڈگری ہو گئی ہے۔ دایہ جونہی آ کر یہ خبر سناتی ہے کہ آپ کے لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ ساری خوشی خاک میں مل جاتی ہے۔ جذبات پر اوس سی پڑ جاتی ہے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے عربوں کے بعض قبیلوں (مضر اور ربیعہ) کی چند شاخوں میں یہ قبیح رسم بھی تھی کہ لڑکیوں کو وہ زندہ دفن کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ سورہ تکویر میں قرآن کریم نے اس قبیح رسم کا تذکرہ بھی فرمایا ہے۔

وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُىِٕلَتْ ۝ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝ (۸۱/۹-۸)

اور خیال تو کرو جب اس لڑکی کے متعلق پوچھا جائیگا جسے زندہ دفن کر دیا گیا تھا کہ آخر وہ کس جرم کی پاداش میں قتل کی گئی تھی۔

کتنے سنگدل اور شقی القلب ہوتے ہوں گے وہ ماں باپ جو محض ایک کمی عار سے بچنے کے لئے اک بے گناہ بچی کو اپنے ہاتھوں زندہ درگور کرتے ہوں گے۔ اور اُن سے کتنے شقی اور بدبخت ہیں وہ ماں باپ جو اگرچہ آج لڑکیوں کو زندہ درگور تو نہیں کرتے مگر زندہ درگور

کرنے سے بدتر کر دیتے ہیں۔ نہ انہیں تعلیم دیتے ہیں۔ نہ انہیں اس قابل بناتے ہیں کہ وہ آزندہ زندگی میں اپنا مقام حاصل کر سکیں کہتے ہیں کہ لڑکیوں کو پڑھانا لکھانا نہیں چاہیئے۔ اس سے ان کی چار آنکھیں ہو جاتی ہیں۔ انہیں گھروں کی چار دیواری میں بھیڑوں بکریوں کی طرح بند رکھنا چاہیئے۔ کہیں باہر کی ہوا ان کو نہ لگ جائے۔ اور جب وہ جوان ہو جاتی ہیں تو بھیڑوں بکریوں کی طرح ان کو فروخت کر دیتے ہیں جس گھر میں وہ جاتی ہیں وہاں ان کا مقام ایک زرخرید باندی سے زیادہ نہیں ہوتا۔ شادی سے پہلے وہ باپ کے گھر میں ایک بن بادی کی طرح زندگی بسر کرتی ہیں۔ اور شادی کے بعد شوہر کے گھر میں بھی ان کا یہی مقام ہوتا ہے۔

ایسے لوگوں پر واضح رہنا چاہیئے کہ یہ بھی ان بچیوں کو زندہ در گور کرنا ہی ہے۔ بلکہ اس سے بھی بدتر۔ اس لئے وہ قرآن کریم کی اس وعید سے بچ نہیں سکتے جو اس جرم کے سلسلہ میں اس نے دی ہے۔

جیسا کہ لڑکوں کو تعلیم دلانا اور ان کی صحیح تربیت کرنا ماں باپ کا فرض ہے۔ ایسے ہی لڑکیوں کی تعلیم و تربیت بھی ان کا فریضہ ہے جیسے لڑکے کی پیدائش باعث عار نہیں ایسے ہی لڑکی کی پیدائش بھی باعث عار نہیں ہے جیسے لڑکے کی پیدائش خدا کی نعمت رحمت، اور دنیوی زندگی کی زینت ہے ایسے ہی لڑکی کی پیدائش بھی خدا کی نعمت، رحمت اور دنیوی زندگی کی زینت ہے۔ ان دونوں میں تفریق کرنا قرآن کی ہدایت کی خلاف ورزی ہے

اولاد کو اپنی مصیبتوں کی بھینٹ چڑھا دینا مجرموں کا شیوہ ہے

سطور بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ ماں باپ پر اولاد کے سلسلہ میں قرآن کریم کی رو سے کتنی بڑی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ انسان کو زندگی میں بعض دقتیں دشواریاں بھی پیش آتی ہیں۔ مصائب و آلام سے دوچار ہونا بھی پڑتا ہے مگر ان مصائب و آلام میں اولاد کی تو کوئی خطا نہیں ہوتی۔ ایسے موقعوں پر اولاد کو ان مصائب و آلام کی بھینٹ چڑھا دینا انتہائی پست ذہنیت کا مظاہرہ ہے۔ بعض شقی القلب لوگ فقر و فاقہ سے تنگ آ کر اولاد کو فروخت کر دیتے ہیں۔ یا ان کی شادی کر کے بڑی بڑی رقمیں وصول کر لیتے ہیں۔ یا ان کی صحیح تربیت اور پرورش سے پہلو تہی کرنے لگتے ہیں۔ ایسا کرنا سراسر ظلم ہے۔ قرآن کی میزان میں یہ روش ایک مجرم کی تو ہو سکتی ہے مگر ایک مومن کی نہیں ہو سکتی۔

يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِي مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍ بِبَنِيهِ ۝ وَصَاحِبَتِهِ وَأَخِيهِ ۝
وَفَصِيلَتِهِ الَّتِي تُؤْوِيهِ ۝ وَمَن فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ يُنجِيهِ ۝ (۷۰/۱۱-۱۴)

مجرم کی یہ تمنا ہوگی کہ اس دن کی تکالیف سے وہ اپنی اولاد کو فدیہ میں دے دے۔ اپنی بیوی اور بھائی کو فدیہ میں دے ڈالے۔ اس قبیلہ کو بدلے میں دیدے جو خود اُسے پناہ دیتا ہے۔ بلکہ زمین کی پوری آبادی کو اپنے بدلہ میں دیدے۔ اور اس طرح خود اپنے آپ کو نجات دے لے۔

مجرمانہ ذہنیت رکھنے والے کسی شخص کی تو یہ روش ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی اولاد، وہ بیوی اور بھائی وغیرہ کو اپنی جگہ مصیبت میں پھنسا کر خود نجات حاصل کرے۔ لیکن مومن سوسائٹی کے کسی فرد کی یہ روش نہیں ہو سکتی۔ مومن ان مصائب کو خنداں پیشانی سے برداشت کرتا ہے

اور اپنے بیوی، بچوں اور بھائیوں کو یہ محسوس بھی نہیں ہونے دیتا کہ وہ خود کسی مصیبت میں گرفتار ہے۔

اولاد کو نصیحت

علم اور عقل اور تجربہ کی کمی کی وجہ سے بعض مرتبہ اولاد ایسے کام کرنے لگتی ہے جو اس کے لئے مفید نہیں ہوتے ایسی صورت میں والدین کا فریضہ ہے کہ وہ خیر خواہانہ طور پر اپنی اولاد کو نصیحت کردیں اور انھیں اونچ نیچ سمجھا دیں اور واضح طور پر سمجھا دیں کہ ایسا کرنے میں ان کے لئے کیا خطرات ہیں۔ اور انھیں کونسا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اس سلسلہ کی کچھ آیات اوپر گذر چکی ہیں۔ جن میں حضرت ابراہیم، حضرت یعقوب، حضرت لقمان اور حضرت نوح علیہم السلام کی نصیحتیں اپنی اولاد کو بیان کی جا چکی ہیں۔ اسی سلسلہ کی کچھ دوسری آیات اب بیان کی جاتی ہیں۔ چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جب اپنے والد سے اپنا خواب بیان کیا کہ انھوں نے گیارہ ستاروں اور سورج اور چاند کو دیکھا ہے کہ وہ انھیں سجدہ کر رہے ہیں تو چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کا بچپن تھا اور وہ اس چھپے ہوئے کینہ اور حسد کو محسوس کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے جو ان کے بھائیوں کے سینوں میں سُلگ رہا تھا اور چونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام سمجھ رہے تھے تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو تاکید فرما دی تھی کہ وہ اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں سے بیان نہ کریں۔ مبادا اس سے سلگتی ہوئی آگ پر تیل نہ پڑ جائے۔ چنانچہ سورہ یوسف میں ہے

إِذْ قَالَ يُوسُفُ لِأَبِيهِ يَا أَبَتِ إِنِّي رَأَيْتُ أَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَأَيْتُهُمْ لِي سَاجِدِينَ ۝ قَالَ يَا بُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُؤْيَاكَ عَلَىٰ إِخْوَتِكَ فَيَكِيدُوا لَكَ كَيْدًا ۖ إِنَّ الشَّيْطَانَ لِلْإِنسَانِ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝ (۱۲/۴-۵)

یاد کرو جب یوسف نے اپنے باپ سے کہا۔ ابا جان میں نے خواب میں گیارہ ستارے اور سورج اور چاند کو دیکھا میں نے انھیں دیکھا ہے کہ وہ مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ تو باپ نے کہا بیٹا! اپنا یہ خواب اپنے بھائیوں کے سامنے بیان نہ کر دینا۔ کہیں وہ تیرے لئے خفیہ تدبیروں میں نہ لگ جائیں۔ شیطان تو انسان کا کھلا دشمن ہے ہی۔

ایسے ہی جب برادرانِ یوسف غلہ کی خریداری کے لئے سرزمین مصر کی طرف روانہ ہونے لگے ہیں تو حضرت یعقوب کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ میری اولاد ایک نئے ملک میں جا رہی ہے۔ معلوم نہیں وہاں کے حالات کس قسم کے ہوں۔ بچے ایک دو نہیں پورے گیارہ تھے۔ اگر یہ سارے لڑکے ایک ساتھ کسی شہر میں داخل ہوں تو شہر والوں کو خواہ مخواہ وہم اور شبہ کرنے کے مواقع پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس لئے لڑکوں کی روانگی کے وقت حضرت یعقوب نے ان کو نصیحت فرمائی کہ

وَقَالَ يَا بَنِيَّ لَا تَدْخُلُوا مِن بَابٍ وَاحِدٍ وَادْخُلُوا مِنْ أَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ۖ وَمَا أُغْنِي عَنكُم مِّنَ اللَّهِ مِن شَيْءٍ ۖ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۖ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ ۖ وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ ۝ (۱۲/۶۷)

اور یعقوب نے کہا۔ اے میرے بیٹو! سب کے سب ایک دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ متفرق دروازوں سے داخل ہونا۔ خدا کے قانون کے مطابق پیش آنیوالی کسی چیز کی میں پیش بندی نہیں کر سکتا۔ فیصلہ تو خدا ہی کا ہے۔ اسی پر میرا بھروسہ ہے۔ اور اسی پر بھروسہ کرنیوالوں کو بھروسہ کرنا چاہیئے۔

مگر یہ نصیحت خیر خواہانہ ہونی چاہیئے آمرانہ نہیں۔ اولاد جب بڑی ہو جائے تو ماں باپ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ خواہ مخواہ اپنی مرضیاں ان پر مسلط کرتے رہیں۔ اس نصیحت کی حیثیت مشورہ سے زیادہ نہیں ہوتی چاہیئے۔ اگر اولاد آپکے مشورہ پر عمل نہیں کرتی۔ وہ آپ کی نصیحت کو قبول نہیں کرتی، تو اس کی وجہ سے آپ کو دلگیر نہیں ہونا چاہیئے۔ یہ حقیقت آپ کو سامنے رکھنی چاہیئے کہ خدا نے اسے بھی عقل دی ہے وہ اپنے برے بھلے کو سمجھنے کا حق رکھتی ہے ہم نے جو کچھ مناسب سمجھا اسے بتادیا اس کے بعد بھی اگر اس نے اس کے خلاف عمل کیا ہے تو ہو سکتا ہے کہ کوئی دوسری مصلحت اس کے ذہن میں ہو جو ہمارے ذہن میں نہ ہو۔ لہٰذا ہمیں اس کا شاکی نہیں ہونا چاہیئے۔ حضرت زید بن حارثہ کو رسول اکرم صلعم نے بالکل اولاد کی طرح پرورش فرمایا تھا اور آپ ان کو اولاد کی طرح ہی چاہتے تھے۔ سارا عرب حضرت زید کو رسول اللہ صلعم کا بیٹا ہی سمجھتا تھا۔ حضرت زیدؓ بھی رسول اکرم صلعم کو اپنا باپ ہی سمجھتے تھے۔ بلکہ باپ سے بھی کہیں زیادہ۔ رسول اللہ صلعم نے حضرت زید کی شادی اپنی پھوپھی زاد بہن سے فرمائی۔ جس پر عمائدین قریش کو اعتراض ہوا اور ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ حضرت زید رسول اللہ صلعم کے متبنیٰ ہونے کے باوجود ایک اسیر جنگ کی حیثیت سے گرفتار ہو کر آئے تھے۔ اور عربی معاشرہ میں ان کا مقام ایک غلام سے زیادہ نہیں تھا۔ اسلام نے اس تفریق کو مٹایا اور یہ سبق دیا کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں رنگ نسل زبان یا جغرافیہ کی بنا پر انسان اور انسان میں کوئی تفریق نہیں کی جا سکتی خاندانی شرافت و شہامت کی کوئی قیمت نہیں۔ اصل قیمت انسان کے اپنے اعمال و کردار کی ہے۔ لیکن یہ تعلیم سارے قریش نے تو تسلیم نہیں کر لی تھی قریش کی اکثریت ابھی تک اسلام سے بیگانہ تھی۔ جو لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔ ان کے دلوں میں بھی اس نئی تعلیم نے اتنا گہرا اثر نہیں کیا تھا کہ وہ فوری طور پر اس خاندانی بے عزتی کو برداشت کر لیتے، غرضیکہ قریش نے اس نکاح کی مخالفت کی اور رسول اکرم صلعم نے پورے ثبات کے ساتھ اس مخالفت کا مقابلہ کیا اور حضرت زیدؓ کا نکاح حضرت زینبؓ سے کر دیا۔ سوء اتفاق کہ یہ جوگ کامیاب نہ ہو سکا۔ اور حضرت زیدؓ نے فیصلہ کر لیا کہ وہ حضرت زینبؓ کو طلاق دیدیں۔ رسول اکرم صلعم کو اس کا علم ہوا ظاہر ہے کہ آپ کو اس کا کس قدر ملال ہوا ہوگا۔ چنانچہ رسول اکرم صلعم نے حضرت زید کو نصیحت فرمائی کہ وہ ایسا قدم نہ اٹھائیں۔

اِذْ تَقُوْلُ لِلَّذِیْٓ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ وَ اَنْعَمْتَ عَلَیْہِ اَمْسِکْ عَلَیْکَ زَوْجَکَ وَ اتَّقِ اللّٰہَ ...... (۳۳)

یاد کرو جب تم اس شخص سے کہہ رہے تھے جس پر خدا نے بھی انعام فرمایا تھا۔ اور تم نے خود بھی اس پر انعام کیا تھا کہ اپنی بیوی کو اپنے ساتھ ہی رکھو۔ اسے طلاق نہ دو۔ اور قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو......

لیکن حضرت زیدؓ نے رسول اکرم صلعم کے اس مشورے یا نصیحت کی تعمیل نہیں کی اور حضرت زینب کو طلاق دیدی۔ اور رسول اللہ صلعم

نے اس کا ذرا بھی بُرا نہیں منایا۔ خدا نے اس پر حضرت زیدؓ کو کوئی تنبیہ نہیں فرمائی۔ رسول اللہ صلعم نے ان کا دوسرا نکاح کر دیا۔ اور زندگی بھر ان سے ویسی ہی محبت فرماتے رہے جیسی اس سے پہلے فرمایا کرتے تھے۔ نہ صرف ان سے بلکہ ان کے بیٹے حضرت اُسامہؓ سے بھی ویسی ہی محبت کرتے رہے ایسی محبت کہ صحابۂ کرام میں حضرت اُسامہؓ حِب رسول اللہؐ (رسول اللہؐ کے محبوب) کے لقب سے پکارے جاتے تھے۔

لہٰذا والدین اپنی اولاد کو نصیحت تو کر سکتے ہیں اور مشورہ تو دے سکتے ہیں۔ مگر اولاد کو اپنی نصیحت یا مشورے کا پابند نہیں بنا سکتے بیٹیوں میں حضرت زینبؓ سے زیادہ فرمانبردار کونسا بیٹا ہو سکتا ہے اور باپوں میں حضرت خاتم النبیین صلعم سے زیادہ واجب الاحترام اور کونسا باپ ہو سکتا ہے۔ مگر ان دونوں کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ اور ہمیں چاہیئے کہ ہم اس واقعہ سے سبق لیں۔

اولاد سے مشورہ کرنا چاہیئے

جب اولاد صاحبِ عقل و شعور ہو جائے۔ اور عاقل و بالغ ہو جائے تو والدین کو چاہیئے کہ اپنے معاملات میں ان سے مشورے لیا کریں۔ عام طور سے دیکھا جاتا ہے کہ والدین اپنی اولاد کو اس قابل ہی نہیں سمجھتے کہ ان سے اپنے اہم معاملات میں مشورہ لیں۔ وہ کتنے ہی بڑے ہو جائیں مگر ماں باپ انہیں بچہ ہی سمجھتے رہتے ہیں۔ والدین کے مشورہ لینے سے اولاد اور ماں باپ کے درمیان بزرگی اور خوردگی کا جو ایک حجاب یا فرق مراتب کی ایک خلیج حائل ہوتی ہے۔ وہ دور ہو جاتی ہے۔ اور اولاد ماں باپ سے زیادہ قریب ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں ان کی صحیح تربیت بھی ہو جاتی ہے۔ اگر وہ کوئی غلط مشورہ دیں تو والدین ان کی غلطی کو ان پر واضح کر سکتے ہیں۔ اور اس طرح ان کی فکر و نظر کی ناہمواریوں کو دور کر کے انہیں سکھا سکتے ہیں کہ معاملات پر کس طرح غور کرنا چاہیئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک خواب دیکھا اور اپنے فرزند ارجمند حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے مشورہ فرمایا۔

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ فَانظُرْ مَاذَا تَرَىٰ ۚ قَالَ يَا أَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۖ سَتَجِدُنِي إِن شَاءَ اللَّهُ مِنَ الصَّابِرِينَ ○ (۳۷/۱۰۲)

جب اسمٰعیلؑ اس قابل ہو گئے کہ اپنے باپ کے ساتھ سعی و عمل میں حصہ لے سکیں تو ابراہیمؑ نے ان سے کہا بیٹا! میں خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ میں تمہیں ذبح کر رہا ہوں۔ ذرا اس پر غور کرو۔ تمہاری کیا رائے ہے؟ اسمٰعیلؑ نے کہا۔ ابا جان! جو حکم آپ کو دیا جا رہا ہے۔ اس کی تعمیل فرمائیے۔ انشاء اللہ آپ مجھے ثابت قدم پائیں گے۔

اتنا ہی نہیں کہ ماں باپ کو اپنے اہم معاملات میں اولاد سے مشورہ کرنا چاہیئے بلکہ گھر میں ایسی فضا پیدا کر دینی چاہیئے کہ موقع پڑنے پر اولاد جب مناسب سمجھے خود بھی مشورہ دے سکے۔ اور ایسا کرنے میں انہیں کوئی حجاب مانع نہ آئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مدین میں تشریف لائے اور پانی کے گھاٹ پر دیکھا کہ لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا رہے ہیں۔ مگر سب کے پیچھے دو لڑکیاں کھڑی ہیں۔ جو اپنے جانوروں کو پانی کی طرف بڑھنے سے روک رہی ہیں۔ حضرت موسیٰ نے ان لڑکیوں سے دریافت کیا کہ وہ اپنے جانوروں کو پانی کیوں نہیں پلاتیں۔

انھوں نے حضرت موسیٰ کو بتایا کہ ان کا باپ کافی بوڑھا ہو چکا ہے اور کمزور ہے۔ ہماری یہ مجال کہاں ہو سکتی ہے کہ ان چرواہوں سے پہلے اپنے جانوروں کو پانی پلا سکیں۔ ہم انتظار کر رہی ہیں کہ یہ لوگ اپنے جانوروں کو پانی پلا کر ہٹ جائیں تو بچا کھچا پانی ہم بھی اپنے جانوروں کو پلا دیں۔ حضرت موسیٰ کے دل درد آگیں نے اس داستانِ مظلومیت کو سنا اور بیتاب ہو گئے۔ اور آگے بڑھ کر انھوں نے ان لڑکیوں کے جانوروں کو خود پانی پلایا۔ دونوں لڑکیاں اپنے گھر گئیں اور بوڑھے باپ سے پوری داستان بیان کرنے کے بعد کہا

قَالَتْ إِحْدٰهُمَا يٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ ۝ (۲۸/۲۶)

ایک لڑکی نے کہا۔ ابا جان! اس آدمی کو آپ اپنے ہاں ملازم رکھ لیجئے۔ بلاشبہ بہترین ملازم وہی ہو سکتا ہے جو قوی ہو اور امانت دار ہو۔ (اور موسیٰ میں یہ دونوں صفتیں موجود ہیں)

آپ کو معلوم ہے کہ یہ دونوں لڑکیاں اور یہ ان کے بوڑھے باپ کون ہیں؟ یہ دونوں لڑکیاں حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادیاں ہیں اور ان کے بوڑھے باپ قوم مدین کے اولوالعزم پیغمبر حضرت شعیب علیہ السلام ہیں۔ اس واقعہ سے ان حضرات کو سبق لینا چاہیئے جو لڑکیوں کو کسی قابل ہی نہیں سمجھتے چہ جائیکہ وہ گھر کے نظم و نسق اور دیگر معاملات میں باپ کو مشورے دے سکیں۔ یہاں حضرت شعیب علیہ السلام نے صاحبزادی کے اس مشورے کو قبول فرمایا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ملازم ہی نہیں بلکہ اپنا داماد بھی بنا لیا ہے۔

اولاد کی پرورش در رضاعت

مغربی تہذیب کے اثر کے ماتحت آجکل ہمارے اونچے گھرانوں میں عموماً یہ دیکھا جاتا ہے کہ مائیں اپنی اولاد کی دیکھ بھال اور ان کو دودھ پلانے کی ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو بری الذمہ سمجھتی ہیں۔ بچے عموماً ماماؤں کے ہاتھوں میں پلتے ہیں۔ اور ٹین کے ڈبوں میں ولایت سے جو خشک دودھ آتا ہے۔ اس پر یا گائے کے دودھ پر بچوں کی پرورش ہوتی ہے۔ حالانکہ جس خیر خواہی اور دلسوزی کے ساتھ بچوں کی پرورش ان کی ماں کر سکتی ہے۔ وہ مامائیں نہیں کر سکتیں ساتھ ہی اپنی ماں کا دودھ بچہ کی غذا کے لئے جس قدر مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ ڈبوں کے دودھ یا گائے کے دودھ میں وہ بات نہیں نہیں ہوتی۔ مصیبت بالائے مصیبت یہ ہے کہ ہمارے ہاں جہالت کی وجہ سے مامائیں نہایت پست اخلاق ہوتی ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں بچوں کو دیدینا ان کی اخلاقی صلاحیتوں کا گلا گھونٹ دینا ہے۔ قرآن کریم نے یہ فریضہ ماں کا بتایا ہے کہ وہ اپنی اولاد کی دیکھ بھال کرے۔ اور ان کو دودھ پلائے۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ .... (۲/۲۳۳)

مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال تک دودھ پلائیں۔ یہ مدت ان لوگوں کے لئے ہے جو رضاعت کی پوری مدت دودھ پلانا چاہیں۔

بلاشبہ اگر ضرورت ہو تو قرآن نے اس کی بھی اجازت دی ہے کہ اجرت پر کسی انا کو رکھ کر اس سے دودھ پلوا لیا جائے ہو سکتا

ہے کہ ڈاکٹری معائنہ کے ایجاں کا دودھ صحت مند ثابت نہ ہو یا ماں کے دودھ ہی نہ ہو۔ یا وہ اس قدر کمزور ہو کہ دودھ پلانے سے اکی کمزوری بڑھ جانے کا اندیشہ ہو۔ ایسی صورتوں میں دوسروں سے بھی دودھ پلوایا جا سکتا ہے۔ مگر محض فیشن کے طور پر اس ذمہ داری سے جان چرانا اور اس پابندی سے آزاد بننا قطعاً مناسب نہیں ہے۔

وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا آتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ .... (۲۳۳/۲)

اگر تم اپنے بچوں کو کسی اور سے دودھ پلوانا چاہو تو اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ بشرطیکہ جو کچھ تمہیں اس کا معاوضہ دینا ہو جانے پہچانے طریقہ پر دیدو۔

رضاعت اور استرضاع کے یہ احکام اگرچہ طلاق کے ضمن میں بیان ہوئے ہیں۔ لیکن بہ تقاضائے ضرورت ان کا اطلاق دوسرے حالات پر بھی ہو سکتا ہے۔

اولاد سے تکلفات نہیں ہونے چاہئیں

متبنیٰ اولاد تمہارے جسم کا ایک حصہ اور تمہارے گھر کا ایک فرد ہیں۔ ان سے کوئی غیریت نہیں برتنی چاہیئے۔ ان سے کوئی ایسا تکلف کا برتاؤ نہیں کرنا چاہیئے۔ جس سے غیریت اور اجنبیت کی بو آتی ہو۔ بلاشبہ عورتوں کے لئے حیاداری ان کا زیور ہے۔ جس عورت میں حیا نہیں اس میں نسائیت ہی نہیں عورتوں کی حیا کا یہ تقاضا ہے کہ وہ اپنے آرائش اور زینت کے مقامات کو مردوں کے سامنے ظاہر نہ کریں۔ لیکن اپنی اولاد سے اس پردہ کی ضرورت نہیں ہے۔

وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا لِبُعُولَتِهِنَّ أَوْ آبَائِهِنَّ أَوْ آبَاءِ بُعُولَتِهِنَّ أَوْ أَبْنَائِهِنَّ أَوْ أَبْنَاءِ بُعُولَتِهِنَّ .... (۲۴/۳۱)

عورتوں کو اپنے زینت و آرائش کے مقامات مردوں کے سامنے ظاہر نہیں کرنے چاہئیں۔ لیکن اپنے شوہروں، والدوں، خسروں، بیٹوں اور سوتیلے لڑکوں کے سامنے ظاہر کر سکتی ہیں۔ (باقی آئندہ)

تاریخ الامت

جلد پنجم و ششم

از:- علامہ حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری

اس کی چار جلدیں پہلے شائع ہو چکی تھیں۔ اب پانچویں اور چھٹی جلدیں تیار ہو کر آگئی ہیں۔ پانچویں جلد میں خلافت عباسیہ کا بقیہ حصہ اور چھٹی جلد میں مصر کی مکمل تاریخ آگئی ہے۔ قیمت جلد پنجم غیر مجلد صرف چار روپے اور جلد ششم تین روپے (علاوہ محصول ڈاک) پیشگی خریداران کو آرڈر دینے کی ضرورت نہیں۔ البتہ جو لوگ یہ کتابیں نہ خریدنا چاہیں۔ وہ ۱۵ جولائی تک اطلاع دیدیں۔

ناظم ادارہ طلوع اسلام ۳/۱۵۹۔ ایل۔ پی۔ ای۔ سی ہاؤسنگ سوسائٹی کراچی نمبر ۲۹

باب المراسلات

۱۔ ملا اور قرآن

راولپنڈی سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ میرا تجربہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی جو آیات ایک معمولی لکھے پڑھے آدمی کی سمجھ میں بھی آسانی سے آجاتی ہیں وہ ہمارے مولوی صاحبان کی سمجھ میں بالکل نہیں آتیں اور جن معنوں کو وہ جھوم جھوم کر بیان کرتے ہیں وہ ایسے ہوتے ہیں جنہیں سنکر معمولی فہم و بصیرت کا انسان بھی ہنس دے لیکن ان مولوی صاحبان کو اس کا کبھی احساس نہیں ہوتا کہ وہ کس قسم کی مضحکہ خیز باتیں کرتے ہیں۔ بالآخر اس کی وجہ کیا ہے؟ کیا یہ لوگ جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں یا ان میں اتنی سمجھ بوجھ ہی نہیں ہوتی؟

طلوع اسلام

ہمارے مولوی صاحبان میں ایک گروہ تو ان کا ہے جو درحقیقت مولوی نہیں ہیں بلکہ "بنے ہوئے" مولوی ہیں۔ انھیں حب کاری اور بیروزگاری نے مولوی بنا دیا ہے۔ ان لوگوں کا نہ قرآن پر ایمان ہے نہ حدیث پر۔ یہ قرآن و حدیث اپنے مفاد کے حصول کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ قرآن کے متعلق انھوں نے مشہور کر رکھا ہے کہ وہ حدیث کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتا۔ اور حدیث کے متعلق ان کا فتویٰ یہ ہے کہ ان میں غلط بھی ہیں اور صحیح بھی۔ جو حدیث ان کے مطلب کے موافق ہو اسے یہ صحیح قرار دے لیتے ہیں اور جو اپنے مطلب کے خلاف جائے اسے غلط کہہ دیتے ہیں۔ اس طرح انھوں نے قرآن کو اپنی مطلب براری کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ یہ شریعت کے متعلق مضحکہ انگیز باتیں جان بوجھ کر کرتے ہیں تاکہ عوام سمجھیں کہ یہ لوگ واقعی بڑے پختہ ایمان کے ہیں کیونکہ ایمان کی پختگی کے متعلق انھوں نے لوگوں سے کہہ رکھا ہے کہ ایمان یہ ہے کہ جو بات تمہاری سمجھ میں نہ آئے اسے بھی صحیح مانو۔ یہ لوگ صرف شریعت کے متعلق اس قسم کی مضحکہ انگیز باتیں کریں گے۔ اپنے دنیاوی کاروبار کے متعلق کبھی ایسی بات نہیں کریں گے۔ جس سے بیوقوفی ٹپکتی ہو۔

دوسری قسم ان مولوی صاحبان کی ہے جو اس قسم کی مضحکہ انگیز باتوں پر دلی ایمان رکھتے ہیں اور انھیں سچا سمجھتے ہیں۔ یہ سمجھنے کے لئے کہ یہ ایسا کیوں کرتے ہیں آپ کسی مذہبی "دارالعلوم" میں جایئے اور دیکھئے کہ وہاں داخل ہونے کے لئے جس قسم کے طالب العلم آتے ہیں وہ کس قدر ذہانت و فطانت اور عقل و خرد کے مالک ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں مشہور تھا کہ خاندان میں جو لڑکا سب سے غبی اور کند ذہن ہوتا اور وہ کسی شعبہ میں بھی کامیاب ثابت نہ ہوتا اسے مذہبی تعلیم کے لئے بھیج دیا جاتا۔ یہ تو ہے وہ (STUFF) جو ہمارے مذہبی مدرسوں میں جاتا ہے۔ اس کے بعد ان مدرسوں کے نصاب تعلیم پر غور کیجئے۔ آپ دیکھیں گے اس میں بھی غور و فکر اور فہم و تدبر کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ ساری تعلیم کی بنیاد تقلید پر ہوتی ہے اور تقلید کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنی عقل و فکر سے کبھی کام نہ لے۔ ان میں سے جو طالب العلم سب سے زیادہ کتابیں

رٹ لے وہی سب سے بڑا عالم سمجھا جاتا ہے۔ یعنی جو یہ بتا سکے کہ فلاں مسئلہ کے متعلق فلاں کتاب میں کیا لکھا ہے اور فلاں امام نے کیا کہا ہے! یہ ہوتا ہے ان کا مبلغ علم! آپ سوچئے کہ اس قسم کی بنیادی ذہنی سطح اور اس قسم کی تعلیم کے بعد کبھی قرآن سمجھ میں آسکتا ہے قرآن سراپا علم و بصیرت کی کتاب ہے۔ اور وہ قدم قدم پر غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ انسان بڑا ذہین اور صاحب عقل و خرد ہو۔ اس کے بعد علم کی دنیا میں اسے معلوم ہو کہ زندگی کے مختلف مسائل کے متعلق انسان نے کیا کیا تحقیقات کی ہیں۔ اس کے اپنے زمانے میں علم کس سطح تک پہونچ چکا ہے۔ اور اس کے دور کے تقاضے کیا ہیں۔ اسی کو قرآن "انفس و آفاق میں آیات اللہ" کا مطالعہ اور مشاہدہ قرار دیتا ہے۔ اس کے بغیر قرآنی حقائق کبھی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن کا سمجھ لینا ان بیچارے مولویوں کے بس کی بات نہیں۔ ان کی اس بے بسی پر غصہ نہیں آنا چاہیئے۔ ان پر ترس کھانا چاہیئے۔ یہ بیچارے معذور ہیں۔ افسوس کرنا چاہیئے اس قوم پر جو اس قسم کے فہم و فراست اور علم و بصیرت کے مالکوں کو اپنا امام (LEADER) سمجھتی ہے۔ اور زندگی کے معاملات میں ان سے راہ نمائی (GUIDANCE) طلب کرتی ہے۔

اس سے بھی زیادہ تاسف ہونا چاہیئے قوم کے ارباب حل و عقد پر جو عقل و علم کے اعتبار سے یقیناً اس قابل ہیں کہ وہ قرآن کو سمجھ سکیں۔ لیکن وہ نہ اس کی ضرورت سمجھتے ہیں نہ انھیں اس کی فرصت ہے۔ وہ اپنی اس عدم توجہی۔ بیگانگی اور کمی کو یہ کہکر چھپاتے ہیں کہ شریعت کے امور علمائے دین ہی سمجھ سکتے ہیں (حالانکہ وہ اپنی خلوتوں میں ان علمائے دین کی ایک ایک حرکت کا مضحکہ اڑاتے ہیں) اور نہیں سوچتے کہ اس سے وہ قوم اور دین دونوں کو کس قدر نقصان پہنچاتے ہیں۔ ان کی اس روش کا نتیجہ ہے کہ

(۱) تعلیم یافتہ طبقہ میں یہ خیال پختہ ہوتا جاتا ہے کہ مذہب، اور سیاست دو الگ الگ شعبے ہیں۔

(۲) عوام بے عقلی۔ جہالت اور اندھی تقلید کو قابل قدر متاع سمجھنے لگ گئے ہیں۔ کیونکہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ایسے ایسے تعلیم یافتہ افسر اور ارباب سیاست ان مولوی صاحبان کو علوم شریعت کا حامل قرار دیتے، اور ان معاملات میں اپنے آپ کو ان کا دست نگر سمجھتے ہیں تو ان کے دل میں یہ بات پختہ ہو جاتی ہے کہ ان مولوی صاحبان کا علم اور ان کی عقل ان "انگریزی خوانوں" سے بہت آگے ہے۔

اور (۳) ان مولوی صاحبان میں جو "بنے ہوئے" مولوی ہیں۔ وہ اس صورت حالات سے ناجائز فائدہ اٹھا کر قانون سازی تک کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لینا چاہتے ہیں۔ اور جو سچ مچ کے مولوی ہیں۔ وہ اپنی مضحکہ انگیز باتوں کو نظر ثانی کا محتاج نہیں سمجھتے اور جو انہیں مضحکہ انگیز قرار دیتا ہے اسے دشمنِ دینِ اسلام ٹھہراتے ہیں۔

یہ ہے صورت حالات جو اس وقت اس بدقسمت ملک میں پیدا ہو رہی ہے۔ اور اس کے ذمہ دار وہ ارباب حل و عقد ہیں جو محض قوم میں مقبول بننے کے لئے ان مولوی صاحبان کو اپنے سر چڑھا رہے ہیں۔ اور اس طرح جہالت و حماقت کو سند پذیرائی عطا کر کے توہم پرستی اور مضحکہ انگیزی کو فروغ دے رہے ہیں۔ اور اسلام جیسے مبنی بر علم و بصیرت دین کو دنیا کے سامنے اضحوکہ بنا رہے ہیں۔

۲۔ منکرین حدیث کہاں ہیں؟

لاہور سے ایک صاحب لکھتے ہیں۔

کچھ عرصہ سے دیگر مذہبی اخبارات میں بالعموم اور جماعت اسلامی کے رسائل میں بالخصوص، ایک ایسی جماعت کا ذکر بار بار کیا جاتا ہے جسے یہ منکرین حدیث کہتے ہیں اور اس کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ لوگ پنج وقتہ نماز کو وبال جان سمجھ کر اس کی تعداد کم کر رہے ہیں۔ اور اس کی ہیئت میں کتر بیونت کر رہے ہیں۔ یہ نو دن کے روزے رکھتے ہیں۔ اور حج کو فرض نہیں سمجھتے۔ وغیرہ وغیرہ۔ کیا آپ بتائیں گے کہ اس قسم کی جماعت پاکستان نہیں تو دنیا کے کس حصہ میں بستی ہے؟ ہمیں تو یہاں لاہور میں اہل قرآن بھی یہ کچھ کرتے نظر نہیں آتے تا بدیگراں چہ رسد؟

طلوع اسلام | اس قسم کی جماعت کا اس خارجی دنیا میں تو کہیں وجود نہیں۔ البتہ یہ ان لوگوں کے ذہنوں میں بستی ہے جو اس قسم کے کذب و افترا سے اپنے رزق کا سامان پاتے ہیں۔ جن لوگوں کی طرف ان کا روئے سخن ہوتا ہے۔ ان کے متعلق یہ اپنے ذاتی علم اور مشاہدہ کی بناء پر بھی جانتے ہیں کہ وہ نہ کوئی نئی قسم کی نماز پڑھتے ہیں۔ نہ مہینے بھر کی جگہ نو دن کے روزے فرض سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ مسلسل و متواتر اپنے پروپیگنڈے میں لگے رہتے ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں اس کے ثبوت میں کسی کی تحریر کا کوئی حوالہ پیش نہیں کرتے۔

بسمارک کے متعلق مشہور ہے کہ جب اس نے دیکھا کہ جرمنی کے باشندے اس کی بات پر کان نہیں دھرتے تو اس نے فرانس کی طرف سے ایک جعلی اعلانِ جنگ (جرمنی کے خلاف) وضع کیا۔ اور ملک میں ڈھنڈورا پیٹ دیا کہ فرانس جرمنی پر حملہ کرنے کی ٹھان رہا ہے اور جرمنی خطرہ میں ہے۔ لوگ جھٹ بسمارک کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ اس سے ہمارے ہاں کے ارباب سیاست نے فائدہ اٹھایا۔ اور جہاں اپنے مفاد کی خاطر لوگوں کو اپنے پیچھے لگانے کی ضرورت محسوس ہوئی فوراً اعلان کر دیا کہ اسلام خطرے میں ہے۔ اب یہی حربہ یہ نیم مذہبی ارباب سیاست بھی استعمال کر رہے ہیں۔ اس کے لئے انہوں نے اپنے ذہن سے ایک نئی جماعت کا وجود تراشا ہے جو دنیا میں کہیں موجود نہیں۔ پھر اس جماعت کے متعلق یہ مشہور کر رکھا ہے کہ اس کے ہاتھوں دین خطرے میں ہے۔ اس کے بعد یہ لوگ دین کو اس خطرے سے بچانے کے لئے اپنے آپ کو بطور محافظ دین پیش کرتے ہیں۔ اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ اگر ہم نہ رہے تو اس (مزعومہ) جماعت کے ہاتھوں دین ختم ہو جائے گا اور (معاذ اللہ) ناموسِ رسالت خطرے میں پڑ جائے گی۔ اور اس "جہادِ عظیم" کے لئے لاکھوں روپے بٹور لیتے ہیں۔ فرمائیے کہ اگر یہ لوگ یہ کہہ دیں کہ اس جماعت کا وجود ہی کہیں نہیں تو پھر یہ سارا کاروبار کس طرح سے چلے؟

ان کے اس "بھان متی کے پٹارے" کا پردہ فاش کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ جب یہ لوگ اس قسم کی بات کریں تو ان سے پوچھا جائے کہ آپ متعین طور پر بتلایئے کہ وہ کون لوگ ہیں جو دین کے متعلق اس قسم کی باتیں کہتے ہیں اور جب وہ کسی کا نام لیں تو ان سے کہا جائے کہ اس شخص یا جماعت کی کوئی تحریر پیش کیجئے۔ جس سے ثابت ہو کہ وہ ایسا کہتے ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اس قسم کے متعین سوالات کے بعد یہ حضرات بغلیں جھانکنے لگ جائیں گے۔ ان لوگوں کے فروغ کا راز یہ ہے کہ مسلمان اس درجہ سہل انگار واقع ہوا ہے کہ وہ کسی کے خلاف کچھ سنتا ہے۔ تو اس کی تحقیق کے لئے ایک قدم تک اٹھانا بھی اس کے لئے دوبھر ہوتا ہے۔ یہ حضرات لوگوں کی اس نفسیاتی

کیفیت سے واقف ہیں۔ اس لئے بڑے دھڑلے سے جھوٹ بولتے چلے جاتے ہیں۔ اگر ہماری قوم جو کچھ سنے اس کی تحقیق کرنے کی تکلیف گوارا کرلے تو آپ دیکھیں گے کہ اس قسم کے ملاؤں کے کھیل کس طرح چند دنوں میں ختم ہو جاتے ہیں۔

ایک ماں کا خط

موقر روزنامہ پاکستان ٹائمز کی ۲۰ مئی کی اشاعت میں "ایک ماں" کی طرف سے ایک خط شائع ہوا ہے جس کا ترجمہ درج ذیل ہے:-

میں دو بچوں کی ماں ہوں جس کا مستقبل ان بچوں کی خوشی سے وابستہ ہے۔ جنہیں میں نے جنم دیا ہے۔ میں نے ان بچوں کو یہ سمجھ کر جنم دیا تھا کہ وہ ملک جو ان کی پیدائش کا ذمہ دار ہے، وہ ان کی خوش حالی اور مسرت کا بھی ضامن ہوگا۔ میں نے اس امید پر انہیں جنم دیا تھا کہ ان کا مستقبل محفوظ ہوگا۔ ان کی تعلیم پختہ بنیادوں پر ہوگی۔ ان کی صحت نہایت عمدہ ہوگی اور انہیں اس ملک پر فخر ہوگا جسے انہوں نے اپنی آنکھ کھولی ہے۔

لیکن میں حیران ہوں کہ اس ملک کو کیا ہوگیا ہے؟ اس کا قدم کہاں سے غلط اٹھا ہے۔ کیوں ایسا ہوا ہے؟ کس طرح ایسا ہوا ہے۔ کس کی غلطی سے ایسا ہوا ہے؟ کس کی وجہ سے ایسا ہوا ہے؟ وہ امیدیں کیا ہوئیں جن کے آسرے پر ہم زندہ تھے؟ ہم ان وعدوں کو جو ہم نے اپنے بچوں سے ان کی پیدائش کے وقت کئے تھے کس طرح پورا کریں؟ ہم ان سوالات کا جواب کیا دیں جو بچے ہم سے ہزار دفعہ پوچھتے رہتے ہیں۔ اس لئے پوچھتے رہتے ہیں کہ یہ اب دن بدن بڑے ہو رہے ہیں۔ اور محسوس کر رہے ہیں کہ وہ زندگی کے اس ساز و سامان سے محروم ہیں۔ جو ایک باترتیب معاشرے میں بچوں کو بطور استحقاق ملتا ہے۔ مکرر صحت کے ازالہ اور بیماریوں کی مدافعت کا سامان کہاں ہے؟ ان کے لئے کھیل کے میدان کہاں ہیں؟ وہ ادارے کہاں ہیں جو ان بچوں کو مفید اور معاون شہری بنا دیں؟ وہ ہسپتال کہاں ہیں جن کی انہیں ضرورت ہے؟ کتابیں کہاں ہیں مدرسے کہاں ہیں؟ ان مدرسوں کو کون تعمیر کرے گا؟ کون ان کے نقشے بنائے گا؟ کون ان وعدوں کو پورا کرے گا جو اس تمام عرصے میں ہم سے کئے جاتے رہے ہیں۔ آپ تو حضور! باہمی دھینگا مشتی میں مصروف ہیں۔ ان وعدوں کو کون پورا کرے گا؟ کیا آپ میں بچوں کے باپ بھی ہیں؟ کیا آپ نے اپنے بچوں سے کوئی وعدے کئے تھے؟ کیا آپ میں بچوں کی مائیں بھی ہیں؟ جس وقت آپ اپنا قیمتی وقت اور توانائی پارٹی بازی کے جھگڑوں اور جوڑ توڑ میں ضائع کرتے ہیں، کیا اس وقت آپ کو اپنے بچوں کے تاریک مستقبل کا کوئی خیال نہیں آتا؟ کیا آپ کے سینے میں ضمیر ہے؟ اگر ہے تو کیا وہ کبھی آپ سے اتنا نہیں کہتا کہ قوم کو آپ کی ضرورت ہے؟

جب کسی انسان کو ایسے بچے نظر آئیں جن کا کوئی پرسان حال نہ ہو۔ جن کی تعلیم کا کوئی انتظام نہ ہو جن کی ضروریات زندگی کا بہم پہنچانے والا کوئی نہ ہو۔ تو ایسے بچوں کو دیکھ کر اگر اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جائے تو وہ

دل نہیں پتھر ہے۔ خواہ وہ بچے اس کے اپنے ہوں یا کسی دوسرے کے۔ کوئی ماں اپنے بچوں میں اور اپنی قوم کے بچوں میں امتیاز نہیں کر سکتی۔ اگر میرے اپنے بچے ابھی تک بیمار نہیں ہوئے۔ یا ان کی ضروریات زندگی رک نہیں گئیں اور وہ بھوکے نہیں مر رہے تو اس سے میرے دل کو کبھی اطمینان نہیں ہو سکتا اس لئے کہ قوم کے لاکھوں بچے ہیں جو بیمار بھی ہیں اور بھوکے بھی۔ اور جنہیں ان کے والدین نے اپنی امیدوں کے ساتھ جنم دیا تھا۔ جن امیدوں کے ساتھ ہم نے اپنے بچوں کو جنم دیا تھا۔

ابھی وقت ہے کہ ان وعدوں کو پورا کیا جائے جو ساڑھے آٹھ سال قبل تشکیل پاکستان کے وقت کئے گئے تھے ابھی وقت ہے کہ ملک کو اس تباہی کے جہنم سے بچا لیا جائے جس کی طرف اسے بدنظمی، پارٹی بازی اور بددیانتی دھکیل کر لے جا رہی ہے۔ ابھی وقت ہے کہ قوم کی تمام ماؤں سے کہا جائے کہ تم مایوس مت ہو جو وعدے ہم نے اور تم نے ان بچوں سے کئے تھے وہ سب پورے ہو کر رہیں گے۔ انہیں یہ بچے اپنی آنکھوں سے پورا ہوتے دیکھیں گے۔ وہ وقت آئے گا کہ جب یہ بچے اپنے ملک کا قومی ترانہ نہیں تو فخر اور مسرت سے اپنے سر کو اونچا کر کے چلیں۔ جو کچھ ہم ان بچوں کے لئے کریں گے یہ بچے اس کی سپاس گذاری کے لئے زندہ رہیں گے۔

لیکن اگر حالات ایسے ہی رہے تو پھر تو اس کی امید نہیں کی جا سکتی کہ یہ بچے زندہ بھی رہ سکیں گے۔

کیا میری یہ اپیل اسمبلی کی پتھر کی دیواروں کو چھید کر اندر جا سکے گی۔ کیا اس نقار خانے میں طوطی کی یہ آواز کسی کے کان تک پہنچ سکیگی! میں اپنی اس پکار کا جواب سننے کے لئے انتظار کروں گی اس لئے کہ مغربی پاکستان کی اسمبلی میں کچھ تو ایسے لوگ ہوں گے ہی جو فہم و شعور سے کام لیں۔ اور سوچیں کہ وہ کس کھیل میں مصروف ہیں۔ اور قوم کے تقاضے کیا ہیں!)

طلوع اسلام | اس خط کو پڑھنے کے بعد ارباب حل و عقد سے اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ

دل صاحب اولاد سے انصاف طلب ہے!

اس ماتا کی ماری ماں نے صرف اپنے دل کا دکھ ہی بیان نہیں کیا۔ ملک کی لاکھوں ماؤں کے دل بے تاب کی ترجمانی کی ہے لیکن ہمیں افسوس ہے کہ ہماری یہ بہن اپنی درد بھری صدا کا کوئی جواب اس ایوان سے نہیں سن سکیگی جس کی دیواریں ہی پتھر کی نہیں بلکہ جس میں بیٹھنے والے انسانوں کے دل بھی پتھر کے ہیں۔ اس نے اپنی توقعات غلط جگہ وابستہ کی ہیں۔ اس لئے اس کا انتظار رائیگاں جائے گا۔ اس کی حسرت بھری نگاہیں تھک کر گر پڑیں گی اس کی پکار کا جواب صرف اس نظام کی طرف سے مل سکتا ہے جو قرآن کی محکم بنیادوں پر استوار ہو اور جو ہر صاحب اولاد سے پورے حتم و یقین سے کہہ سکے کہ اطمینان رکھو نحن نرزقکم وایاھم ہم تمہاری ضروریات زندگی کے بھی ذمہ دار ہیں اور تمہاری اولاد کی ضروریات کے بھی۔ وہ نظام جس میں ہر بچہ خود مملکت کی ذمہ داری بن جاتا ہے کیونکہ وہ مملکت اس خدا کے نام پر وجود پذیر ہوتی ہے جو اپنے آپ کو رب العالمین کہتا ہے۔ یعنی تمام نوع انسانی کی پرورش کا ذمہ دار۔ اس نظام کے علاوہ کوئی اور نظام اس عالمگیر ذمہ داری کو پورا نہیں کر سکتا۔ خواہ اس کا نام اسلامی ہی کیوں نہ رکھ لیا جائے۔

طاھرہ کے نام ۴

تمہارے لئے طاہرہ بیٹی! اس بات کو لی الواقعہ باعث تعجب ہونا چاہیئے کہ قرآن ایک طرف تو زندگی کے بڑے بڑے اہم معاملات کے متعلق صرف اصولی ہدایات پر اکتفا کرتا ہے۔ لیکن دوسری طرف معاشرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں کی جزئیات تک کو بھی خود ہی بیان کر دیتا ہے۔ لوگوں سے ترش روئی سے پیش نہ آؤ۔ چلا کر نہ بولو۔ اکڑ کر نہ چلو۔ کسی کے ہاں جاؤ تو اجازت لے کر گھر میں داخل ہو۔ مجلس میں یوں بیٹھو۔ جب کام ہو جائے تو دوسرے کا وقت بیکار باتوں میں ضائع نہ کرو۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن عزیزہ! تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ زندگی میں ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ بڑے بڑے معاملات، زندگی میں کبھی کبھی پیش آتے ہیں۔ اور عام طور پر ان کا تعلق بڑے بڑے لوگوں سے ہوتا ہے۔ لیکن معاشرہ کی روزمرہ کی باتیں قدم قدم پر سامنے آتی ہیں اور ہر شخص کو ان سے واسطہ پڑتا ہے۔ زندگی کے قلعہ کی بنیادیں تو بیشک اٹل حقائق پر استوار ہوتی ہیں جنہیں قرآن نے اصولی طور پر بیان کیا ہے۔ لیکن اس کی اوپر کی عمارت ان اینٹوں سے تعمیر ہوتی ہے جو روزمرہ کی ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے ذرات سے تیار ہوتی ہیں۔ ذرا سوچو کہ ایک شخص کتنا ہی اصول پرست کیوں نہ ہو۔ اگر وہ ترش رو اور بد خلق ہے تو جن لوگوں کو اس سے واسطہ پڑے تو جس قدر ان کے لئے باعث زحمت اس کی اصول پرستی ہوگی۔ اس سے کہیں زیادہ موجب کلفت اس کی بدخلقی ہوگی۔ ہر شخص اس کے پاس جانے سے گھبرائے گا۔ وہ کوشش کرے گا کہ اس سے معاملہ ہی نہ پڑے۔ اصل یہ ہے کہ انسانی کردار (کیریکٹر) کی جھلک ان چھوٹی چھوٹی باتوں ہی سے چھن کر باہر آتی ہے۔ اصول پرستی زندگی کے موٹر میں پٹرول کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ ٹھیک ہے کہ گاڑی پٹرول ہی کے زور سے چلتی ہے۔ لیکن انہیں معلوم ہے تاں کہ سلیم میاں پٹرول کے ساتھ موبل آئل کا کتنا خیال رکھتے ہیں وہ کہا کرتے ہیں کہ پٹرول کے ختم ہونے سے تو زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ گاڑی رک جائے گی۔ لیکن موبل آئل کے نہ ہونے سے اس کے پرزے جل جائیں گے۔ اصول پرستی اگر پٹرول کی حیثیت رکھتی ہے تو یہ چھوٹی چھوٹی معاشرتی جزئیات زندگی کی گاڑی میں موبل آئیل کا کام دیتی ہیں ان کے نہ ہونے سے پرزوں میں ایسی رگڑ (FRICTION) پیدا ہوتی ہے۔ جس سے باہمی تعلقات کے نرم و نازک رشتے (دھاگے) جل جاتے ہیں۔ پھر یہ بھی سوچو کہ معاشرتی زندگی کی جن چھوٹی چھوٹی جزئیات کو قرآن نے بیان کیا ہے یا ان سے ملتی جلتی دوسری باتیں۔ کیا ان کی اہمیت محض ہنگامی اور وقتی تھی۔ یا وہ بھی ابدی حقائق کی طرح مستقل اہمیت رکھتی ہیں؟ کیا بدخلقی اور ترش روئی آج سے چودہ سو سال پہلے مذموم تھی۔ اور آج وہ قابل تعریف صفت سمجھی جاتی ہے؟ تم دیکھو گی کہ یہ باتیں جس طرح اس زمانے میں اپنی اہمیت رکھتی تھیں اسی طرح آج بھی

اہم ہیں۔ اس لئے ان معاشرتی آداب و اخلاق کا اپنا مقام ہے۔ اور ان کی نگہداشت انتہائی ضروری۔

اس قسم کے معاشرتی ضوابط یوں تو زندگی کے ہر گوشے میں اہمیت رکھتے ہیں۔ لیکن گھر کی زندگی میں ان کی اہمیت اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ میرے سامنے کتنے ہی گھرانے ہیں جن میں (میاں بیوی یا دیگر متعلقین میں) اصولی طور پر کوئی بات قابل اعتراض نہ تھی لیکن ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال نہ رکھنے سے گھر میں سکھ اور سکون نہیں رہا تھا۔ یا کم از کم میاں بیوی میں وہ بات نہیں رہی تھی جسے قرآن نے مودت اور رحمت سے تعبیر کیا ہے۔ ذرا غور کرو بیٹی! کہ جب میاں گھر میں آئے تو اس کی طرف سے مسکراہٹ آمیز سلام اور بیوی کی طرف سے خندہ پیشانی سے اس کا جواب کتنی کلفتوں کو دور اور کتنے غم غلط کر دیتا ہے۔ یا ایک کی نادانستہ غلطی پر دوسرے کا ہنس دینا گھر کی فضا کو کتنے جنتی شگوفوں کی لپیٹ سے بچا کر جنت در آغوش بنا دیتا ہے۔ یا ایک کی غصے کی حالت میں دوسری طرف سے دھیمی آواز سے جواب کس طرح بھڑکتی آگ پر پانی ڈال دیتا ہے۔ دوسری طرف کسی اختلافی معاملہ پر سنجیدگی سے گفتگو کرنے کی بجائے بیوی کا منہ بسور کر خاموشی سے دوسرے کمرے میں چل دینا۔ دونوں میں کتنی گہری خلیج پیدا کر دیتا ہے یا غلطی کا اعتراف نہ کرنا اور اپنی بات کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے بحث کرتے چلے جانا گھر کی زندگی کو کس قدر سکون فراموش بنا دیتا ہے۔ یہ تو خیر پھر بھی بدخلقی اور ترش روئی یا اسی انداز کی چیزیں ہیں۔ میں نے تو یہاں تک دیکھا کہ گھر کی چھوٹی چھوٹی سی باتوں میں بے احتیاطی، گھر کی زندگی میں کس طرح بدمزگی پیدا کر دیتی ہے۔ تم نے اپنی ممانی مرحومہ کو دیکھا ہوگا لیکن ان کی گھر کی زندگی کے مطالعہ کرنے کا تمہیں موقع نہیں ملا ہوگا۔ تم بہت چھوٹی تھیں جب ان کا انتقال ہو گیا۔ مرحومہ کے متعلق میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جسے گناہ یا جرم کہتے ہیں میں نے ساری عمر میں کوئی ایک بات بھی ایسی اُن سے سرزد ہوتے نہیں دیکھی۔ ایسی نیک اور پاکباز زندگی جس کی مثال کم ملے۔ دیانت اور امانت کی پیکر۔ دل کی اتنی نرم کہ ملازم کسی کے پاؤں میں کانٹا چبھ جائے تو وہ رات بھر روتی رہیں۔ سیر چشمی کا یہ عالم کہ اس اللہ کی بندی نے ساری عمر میں کبھی تمہارے ماموں سے یہ نہیں کہا کہ مجھے فلاں کپڑا لا دو یا فلاں زیور خرید دو۔ ماموں تمہارے، اتنی آمدنی کے باوجود، درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ میرا مطلب سادہ زندگی سے ہے۔ گھر کی عام ضروریات کے بعد جو کچھ باقی بچتا سب نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے تعمیری کاموں میں صرف ہو جاتا۔ وہ ایک عالی عہدے پر فائز تھے۔ اور ان کے ہمعصروں کے گھروں میں زندگی کا جو ٹھاٹھ باٹھ تھا۔ وہ سب کے سامنے تھا۔ موٹریں۔ کوٹھیاں۔ نوکر چاکر۔ جھاڑ فانوس۔ جھلملک۔ زیور۔ ساڑھیاں۔ غرضیکہ وہ سب کچھ جو موجودہ دور میں افسروں کی گھر کی زندگی کا جزو لازم قرار پا چکا ہے۔ یہ سب کچھ تمہاری ممانی کے سامنے تھا اور اس کے مقابلہ میں اپنے گھر کی سادہ زندگی جسے تقابل کے لئے غریبانہ زندگی کہا جائے گا۔ لیکن اس نے کبھی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ اور لب پر حرف شکایت لانا تو ایک طرف۔ کبھی دل میں بھی اس کا خیال نہیں گذرا کہ ان کے مقابلے میں ہمارا معیار زندگی کیا ہے۔ تم حیران ہوگی کہ مرحومہ کو بہت کم معلوم ہوتا تھا کہ تمہارے ماموں کی تنخواہ کیا ہے۔ نہ ہی اس نے کبھی اس کے معلوم کرنے کی ضرورت ہی سمجھی۔ سوچو طاہرہ! اس قسم کی عورت تمہیں آج کہیں دور دور بھی دکھائی دیتی ہے؟ دوسری طرف تمہارے ماموں ہیں جن کے متعلق اب تم مجھ سے بھی زیادہ جانتی ہو۔ اگر وہ عورتوں میں اپنی مثال نہیں رکھتی تھیں۔ تو یہ مردوں میں اپنی خصوصیات کے واحد مالک ہیں۔ تم انہیں اس بڑھاپے میں بھی دیکھو۔ دل اور دماغ دونوں کے اعتبار سے کتنے بلند ہیں۔ اب ظاہر ہے

کہ اگر اس گھر کی زندگی جس میں میاں بیوی اس انداز کے ہوں جنت کی زندگی نہیں ہوگی تو پھر اس زمین پر جنت اور کہاں مل سکیگی؟

لیکن تم یہ سنکر حیران ہو گے کہ اس کے باوجود اس قسم کی رفاقت کو نتیجہ جس قدر خوشگوار ہونا چاہیئے تھا۔ وہ ایسا خوشگوار نہیں تھا۔ اس سے تم کوئی غلط مفہوم نہ لے لینا۔ ان کی رفاقت کی پختگی کا تو تم اس سے اندازہ لگا سکتی ہو کہ اگرچہ مرحومہ کا انتقال اس وقت ہوا تھا جب ماموں ہنوز ادھیڑ عمر کے تھے۔ لیکن اس کے بعد انھوں نے دوسری شادی کا خیال تک بھی نہیں کیا۔ اور اس کے لئے وہ کئی بار خود تمہارے سامنے بھی کہہ چکے ہیں کہ میں نے اس لئے پھر شادی نہیں کی کہ مجھے تمہاری ممانی جیسی کوئی دوسری عورت نظر نہیں آئی۔ جو کچھ میں کہنا چاہتا ہوں وہ صرف یہ ہے کہ اتنی خوبیوں کی وجہ سے گھر کا انداز جس قدر جنت آفریں ہونا چاہیئے تھا۔ وہ ایسا نہیں تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ مرحومہ جہاں زندگی کے بڑے بڑے اصولوں میں اتنے بلند معیار کا ثبوت دیتی تھیں۔ روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں میں چنداں محتاط نہیں تھیں۔ وہ ترش رو اور بد خلق بھی نہیں تھیں۔ ایسی رقیق القلب اور ہمدرد عورت بد خلق کیسے ہو سکتی ہے! لیکن وہ گھر کی معمولی باتوں میں احتیاط نہیں برتتی تھیں۔ اس کے برعکس، ماموں بلند اصولوں کے ساتھ ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں بھی بہت محتاط تھے۔ مثلاً ماموں وقت کے بہت پابند تھے۔ اب تک تم نے دیکھا ہوگا کہ وہ پابندیٔ وقت کو کس قدر اہمیت دیتے ہیں۔ اور اس کی کتنی شدت سے احتیاط برتتے ہیں۔ لیکن تمہاری ممانی (جیسا کہ ہمارے معاشرے کی عورتوں کا عام معمول ہے) وقت کا کبھی خیال نہیں کرتی تھیں۔ بات بڑی چھوٹی سی ہے لیکن تم سوچو کہ صبح سے شام تک کتنے مقامات پر ان دونوں کا اسی ایک معمولی نقطہ پر ٹکراؤ ہوتا ہوگا۔ ٹکراؤ سے میری مراد یہ نہیں کہ وہ لٹھم لٹھا ہو جاتے تھے۔ ٹکراؤ سے میری مراد ذہنی ٹکراؤ ہے۔ اور تمہارے ماموں جیسے حساس انسان کے لئے اس قسم کا ذہنی ٹکراؤ لٹھم لٹھا سے بھی زیادہ تکلیف دہ تھا۔ ہم اکثر دیکھتے کہ ان دونوں نے کہیں باہر جانا ہے۔ ماموں تیار ہو کر باہر کے دروازے میں کھڑے ہیں۔ اور ممانی گھر سے نکلنے کا نام نہیں لیتیں۔ پوچھنے پر معلوم ہوتا کہ ممانی کو جوتے کا ایک پاؤں نہیں مل رہا۔ یہ ان دونوں کی عادتوں کا دوسرا اختلاف تھا۔ ماموں کی زندگی کا یہ انداز کہ ان کی ہر شے اپنی اپنی جگہ پر رکھی ہے۔ اس طرح کہ اگر رات کے اندھیرے میں بھی وہ ہاتھ بڑھائیں تو سیدھا شے مطلوب پر جا کر پڑے۔ اس کے برعکس ممانی کی یہ کیفیت کہ اگر نمکدان مل گیا ہے تو مرچوں والے ڈبے تک کا پتہ نہیں چلتا۔ اور اگر سل سامنے رکھی ہے تو اس کا بٹہ نہیں ملتا۔ جب گھر میں جاؤ تو سب سے پہلا فقرہ جو کان میں پڑتا یہی ہوتا تھا کہ ابھی میرے ہاتھ میں تھی یاد نہیں پڑتا کہاں رکھ بیٹھی ہوں۔" یہ دونوں کی عادات میں تیسرا اختلاف تھا۔ ماموں کے حافظہ کا اب تک عالم ہے کہ رات چلتے چلتے تمہیں بتلاتے جاتے ہیں کہ تیس برس ہوئے یہاں ایک پتھر ہوتا تھا اور وہاں ایک کھمبا۔ اور ممانی کی بھول کی یہ کیفیت کہ ایک شام میں نے دیکھا کہ توا چولھے پر رکھا ہے اور خود پریشان سی ہیں۔ میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ کہنے لگیں کہ آج آٹا گوندھنا ہی بھول گئی۔ توا چولھے پر رکھا تو یاد آیا۔ ادھر ماموں کی طبیعت ایسی کہ اگر کھانا ذرا بھی بے وقت ہو گیا تو پھر کچھ نہیں کھاتے تھے۔ ماموں اپنے کمرے سے نکل کر غسل خانے کی طرف جاتے تو ہم دیکھتے کہ انھوں نے چلتے چلتے چارپائی کو ذرا پیچھے سرکا دیا کرسی کو آگے بڑھا دیا۔ پردے کو سیدھا کر دیا نیچے کی کتاب اٹھا کر اس کے بستے میں رکھ دی۔ لیکن جب وہ غسل خانے میں پہنچتے تو دیکھتے کہ وہاں

صابن ہے تو تولیہ نہیں. قمیض ہے تو بنیان نہیں. وہ ان باتوں پر طوفان نہیں مچا دیتے تھے. وہ جانتے تھے کہ بیوی کی خوبیوں کا پلڑا کتنا جھکا ہوا ہے. اور اس کی یہ خامیاں غلط تربیت کا نتیجہ ہیں. لیکن انھیں اس سے جس قدر کوفت ہوتی تھی اس کا تو اندازہ لگایا جا سکتا ہے! اس سے تم یہ نہیں سمجھ لینا کہ تمہاری ممانی پھوہڑ تھیں. بالکل نہیں. بات صرف یہ تھی کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں میں جتنی احتیاط برتنی چاہیئے. وہ اتنی احتیاط نہیں برتتی تھیں. اگر تمہارے ماموں بھی ویسے ہی بے احتیاط ہوتے تو پھر چنداں مضائقہ نہ تھا لیکن چونکہ ان کی طبیعت مختلف تھی. اس لئے اس سے انھیں کوفت ہوتی تھی. اگر ممانی تھوڑی سی بھی کوشش کرتیں تو ان باتوں پر قابو پا لینا کچھ دشوار نہ تھا. انھیں ایسا کرنا چاہیئے تھا.

اس مقام پر (تم نہیں تو تمہاری سہیلیاں ضرور) کہدیں گی کہ دیکھ لو! یہ پرویز صاحب مرد ہیں ناں. اس لئے مردوں کی طرفداری کرتے ہیں. یہ کہتے ہیں کہ ممانی کو چاہیئے تھا کہ وہ اپنے اندر تبدیلی پیدا کر کے، اپنی عادات کو ماموں کی عادات سے ہم آہنگ کر لیتیں. یہ کیوں نہیں کہا کہ ماموں کو چاہیئے تھا کہ وہ ممانی کے دوش بدوش چلنے لگ جاتے! لیکن عزیزہ! غور تو کرو اس میں طرفداری اور مخالفت کی کوئی بات نہیں. یہ ظاہر ہے کہ ممانی کی بے احتیاطی کوئی اچھی عادت نہ تھی. اس کے برخلاف ماموں کا انداز زندگی مستحسن تھا. یہ وجہ ہے جو میں نے کہا ہے کہ ممانی کو چاہیئے تھا کہ اپنی عادات میں تبدیلی پیدا کر کے اس تصادم کو دور کر لیتیں. اگر ماموں بے احتیاط ہوتے اور ممانی با احتیاط تو میں یہی مشورہ ماموں کو دیتا.

تم پوچھو گی کہ اگر دونوں بے احتیاط ہوتے تو پھر؟ پھر یا تو دونوں باہمی مشورہ سے اپنی عادات میں اصلاح کر لیتے، اور اگر ایسا ممکن نہ ہوتا تو پھر یہ دونوں اسی طرح چلے جاتے. جھگڑا ان میں پھر بھی پیدا نہ ہوتا. گھر کی زندگی میں میاں بیوی میں ہم آہنگی نہایت ضروری ہے. سب سے پہلے امور میں. اور اس کے بعد عادات و خصائل کی جزئیات میں. تمہیں معلوم ہے کہ قرآن نے مومن مرد اور مشرک عورت یا مشرک مرد اور مومن عورت کی شادی سے کیوں منع کیا ہے؟ اس لئے کہ شرک اور ایمان دو متضاد اصول ہیں جو زندگی کی مختلف راہوں کی طرف لے جاتے ہیں. قرآن اس حقیقت کو واضح کرنا چاہتا ہے کہ متضاد نظریات زندگی رکھنے والے مرد اور عورت کبھی دو قالب و یک جان ہو کر ازدواجی زندگی بسر نہیں کر سکتے. اگر اس قسم کے متضاد اصول رکھنے والے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں گے تو ان کی زندگی جہنم کی زندگی بن جائے گی. وہ کہتا ہے کہ اس قسم کے رشتہ کو روا رکھنے والے أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ تمہیں جہنم کی دعوت دیتے ہیں وَاللَّهُ يَدْعُوا إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِإِذْنِهِ (۲/۲۲۱) اور اللہ اپنے اس حکم کی رو سے تمہیں اس زندگی کی طرف دعوت دیتا ہے. جس میں جنت کی خوشگواریاں اور تباہیوں سے حفاظت کا سامان ہے.

تم نے غور کیا طاہرہ! کہ طبیعتوں کے ان جوڑ رشتوں کو خدا کس طرح جہنم کے عذاب سے تعبیر کرتا ہے. یہ تو پھر بھی شرک اور توحید کا فرق ہے جو زندگی کی یکسر متضاد راہیں ہیں. قرآن اس باب میں یہاں تک کہتا ہے کہ اَلْخَبِيثَاتُ لِلْخَبِيثِينَ وَالْخَبِيثُونَ لِلْخَبِيثَاتِ خبیث عورتیں خبیث مردوں کے لئے ہیں اور خبیث مرد خبیث عورتوں کے لئے. اس کے برعکس اَلطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِينَ وَالطَّيِّبُونَ لِلطَّيِّبَاتِ (۲۴/۲۶) طیب عورتیں طیب مردوں کے لئے ہیں اور طیب مرد طیب عورتوں کے لئے. خبیث اور طیب

قرآن کی بڑی جامع اصطلاحیں ہیں۔ ان میں قلب ونگاہ کی خباثت ولطافت سے لے کر عادات وخصائل کی ناخوشگواری وخوشگواری تک سب کچھ شامل ہے۔ وہ میاں بیوی کی یک رنگی وہم آہنگی کو بنیادی شرط قرار دیتا ہے۔ وہ جہنمی کو جہنمی کے ساتھ باندھتا ہے اور جنتی کا دامن جنتی کی چولی کے ساتھ ٹانکتا ہے۔ لہٰذا ازدواجی زندگی کو جنتی بنانے کے لئے ضروری ہے کہ میاں میں جتنی اچھی عادتیں ہوں، بیوی انھیں اپنے اندر پیدا کرلے۔ اور بیوی میں جتنی خوشگوار باتیں ہوں، میاں اپنے آپ کو ان سے ہم آہنگ کرے۔ اس باب میں روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر خاص طور پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ہمارے ہاں کے برخود غلط مردوں کو تو چھوڑیئے۔ ان کے دماغ پر چونکہ یہ خناس سوار ہے کہ مرد، عورتوں پر بہرحال غالب اور فائق ہے۔ اس لئے وہ بیوی کی اچھی عادت کی تقلید میں بھی اپنی ذلت سمجھتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں کی عورتوں کی بھی یہ حالت ہے کہ وہ محض طبیعت کے تساہل سے اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرنا چاہتیں اور جب ان سے میاں کچھ کہے تو وہ منہ بنا کر کہہ دیتی ہیں کہ ہم تو اچھی بری جیسی بن گئیں ویسی ہی رہیں گی۔ آپ کے مطلب کی بیویاں ولایت سے ملیں گی۔ وہاں سے لے آیئے! تم سوچو بیٹی! یہ ذہنیت کس قدر خراب ہے اور اس قسم کی احمقانہ باتیں کتنے تباہ کن نتائج پیدا کرتی ہیں۔ جب میاں بیوی کا رشتہ جسم اور لباس کا سا ٹھہرا (هن لباس لکم وانتم لباس لهن) تو پھر ان کے لئے ایک دوسرے کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ وہ لباس ہی کیا جو بدن پر فٹ نہ آئے۔

اب تم سمجھ گئیں کہ قرآن روزمرہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر اس قدر زور کیوں دیتا ہے۔ اور گھر کی زندگی میں ان باتوں کی اہمیت کس قدر ہے؟ اچھا خدا حافظ! جاوید میاں کو بہت بہت دعا دینا۔

ہاں سننا! اس خط کو کہیں ماموں صاحب نہ دیکھ پائیں۔ وہ ممانی مرحومہ کے خلاف کسی سے ایک لفظ بھی سننے کے لئے تیار نہیں۔ کیسی بلند خصائل کی تھی وہ محترم خاتون اور کتنے پاکیزہ مزاج ہیں یہ ان کے میاں! — اب ایسے لوگ کہاں سے ملیں گے؟

دعاگو

پرویز

سلیم کے نام — آئندہ پرچے میں پڑھیے

قرآنی فیصلے

روزمرہ کی زندگی کے متعلق ساٹھ اہم مسائل ومعاملات پر قرآنی روشنی میں بحث

مجلد گرد پوش — ضخامت ۴۰۸ صفحات

قیمت: چار روپے

ایک مفید مشغلہ

شہناز: ارے اتنے سارے ٹکٹ! الطاف یہ کیسے ہیں؟

الطاف: بھئی یہ عام ٹکٹ نہیں ہیں یہ تو سیونگز ٹکٹ ہیں جن سے روپیہ ملتا ہے۔

شہناز: تم ان ٹکٹوں کا کیا کرو گے؟

الطاف: دیکھو اب یہ کارڈ بھر گیا ہے اب میں اسے ڈاکخانے لے جاؤں گا اور اس کے بدلے پانچ روپے کا ایک سیونگز سرٹیفکیٹ لے لوں گا پھر میں اور ٹکٹ جمع کروں گا اور اسی طرح ان کے بدلے بھی سرٹیفکیٹ لے لوں گا۔ دس سال بعد پانچ روپے والا سرٹیفکیٹ سات روپے ایک آنے کا ہو جائے گا۔ دیکھا بچت کا کتنا اچھا طریقہ ہے!

شہناز: کیا میں بھی یہ ٹکٹ خرید سکتی ہوں؟

الطاف: کیوں نہیں، تم بھی پیسے بچاؤ تو خرید سکتی ہو۔ سچ مچ سب لڑکے لڑکیاں اس طرح روپیہ جمع کریں تو کتنے اچھے رہیں۔

پاکستان سیونگز ٹکٹ خریدیے

تمام ڈاکخانوں سے ملتے ہیں۔

manhattan AFP-37/56 (11)

بقیہ لمعات

(صفحہ ۸ سے آگے)

تبدیلیٔ قلب و نظر

پلان میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ملک کی فلاح و بہبود کے لئے جو اسکیمیں پیش کی گئی ہیں انہیں بڑے کارخانے اور کامیاب و نتیجہ خیز بنانے کے لئے ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو ان کاموں کے اہل ہوں جنہیں ان کے لئے ٹریننگ حاصل ہو لیکن

ان باتوں سے کہیں زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ عمالِ حکومت (سرکاری ملازمین) کے قلب و نگاہ میں تبدیلی پیدا کی جائے۔

جس سے وہ اپنی ذمہ داریوں کو دیانت و امانت اور حسن نیت کے ساتھ سرانجام دیں۔ یہ بہت بڑا اور بنیادی سوال ہے جسے اس پلان میں سامنے لایا گیا ہے۔ لیکن حکومت کی طرف سے یہ بات پہلی مرتبہ نہیں کہی گئی (ہم نے "حکومت" اس لئے کہا ہے کہ پلاننگ بورڈ خود حکومتِ پاکستان کا ادارہ ہے) یہ بات پہلے دن سے اب تک مسلسل دہرائی جا رہی ہے کہ ہمارے عمالِ حکومت نااہل، تغافل پیشہ، بددیانت اور خائن ہیں۔ لیکن آج تک کسی نے یہ نہیں بتایا کہ ایسا کیوں ہے۔ اور اس کا علاج کیا ہے۔ ہمیں توقع تھی کہ اس پلان میں اس مرض کی تشخیص اور اس کے علاج کے متعلق کچھ کہا گیا ہوگا۔ لیکن ہمیں اس میں بھی کچھ نہیں ملا۔ کہا صرف اتنا ہی گیا ہے کہ سرکاری ملازمین میں تبدیلیٔ نگاہ کی ضرورت ہے۔ حالانکہ یہ کہنا چاہیئے تھا کہ اس پانچ سال میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرنے کے لئے یہ کچھ کیا جائے گا۔ اس سے بات بالکل نکھر کر سامنے آجاتی ہے۔

(۱) حکومت کو اعتراف ہے کہ اس پلان کی کامیابی کے لئے عمالِ حکومت میں نگاہ کی تبدیلی کی ضرورت ہے۔

(۲) یہ تبدیلی نہ آج موجود ہے نہ ہی اسے پیدا کرنے کے لئے کوئی تجاویز بتائی گئی ہیں۔

(۳) یہ تبدیلی از خود پیدا ہو نہیں سکتی۔ اس لئے نتیجہ ظاہر ہے کہ اس قسم کے ہزار پلان بنا لیجئے وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔

اصل یہ ہے کہ اس ضمن میں جو کچھ ہمارے ارباب حکومت میں ہو رہا ہے وہ اس سے پہلے ارباب مذہب میں ہو رہا تھا (اور اب تک ہو رہا ہے) ہمارے مولوی صاحبان نے جب دیکھا کہ مولویوں کی سیرت و کردار کے متعلق جو کچھ کہا جاتا ہے۔ وہ بالعموم حقیقت پر مبنی ہوتا ہے تو انہوں نے "علمائے سوء" اور "علمائے خیر" کی اصطلاحات وضع کیں۔ اس کے بعد یہ ہوتا ہے کہ ہر مولوی ان تمام خرابیوں کو ایک ایک کر کے گناتا ہے۔ جو مولویوں میں بالعموم پائی جاتی ہیں۔ اور اس کے بعد کہہ دیتا ہے کہ یہ سب خرابیاں "علمائے سوء" کی ہیں۔ علمائے خیر ان سے مستثنےٰ ہیں۔ اس طرح وہ باقی مولویوں کو تو علمائے سوء قرار دے دیتا اور اپنے آپ کو اور اپنے ساتھیوں کو علمائے خیر میں شمار کر لیتا ہے۔ اب یہی کچھ ہمارے ہاں عمالِ حکومت اور ارباب سیاست میں ہو رہا ہے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی تقریرات اور بیانات میں ان تمام خرابیوں کا ایک ایک کر کے شمار کراتا ہے جو ہماری حکومت و سیاست میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن ان کا تذکرہ اس طرح سے کرتا ہے گویا یہ دوسروں میں پائی جاتی ہیں اور یہ خود (اور شاید اس کی پارٹی) ان سے بالکل مبرا ہے۔ ظاہر ہے جب کسی معاشرہ کی حالت یہ ہو جائے۔ تو اس کی اصلاح انقلابی طریقوں DRASTIC MEASURES کے علاوہ اور کسی طرح ممکن نہیں ہوتی۔

زمین کے متعلق

اس پلان میں زرعی اصلاحات، یا زمین سے متعلق مسائل کے بابت جو کچھ کہا گیا ہے ہم نے اسے آخر میں اٹھا رکھا تھا، اس لئے کہ خود پلان میں کہا گیا ہے کہ ہماری آبادی کا قریب نوے فیصدی حصہ دیہات میں بستا ہے۔ اس لئے جو مسائل اس آبادی سے متعلق ہوں گے انہیں ملک میں یقیناً بنیادی حیثیت حاصل ہوگی۔ زرعی اصلاحات کے متعلق پلاننگ بورڈ کے چیئرمین، محترم زاہد حسین صاحب نے، ماہرین معاشیات کی کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا

> ہمارا زرعی نظام ایک جاندار اور ذی قوت معاشرہ کے نصب العین کی راہ میں ایک موثر روک ہے۔ یہ نظام، معاشرہ میں بہت بڑے مظالم اور ان عدم مساوات کا ذمہ دار ہے۔ جن سے معاشرتی فلاح کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ یہ نظام اس قسم کے معاوضہ کی شکل کو مستقل طور پر برقرار رکھتا ہے جو دور حاضرہ کے حالات وکوائف سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتا۔ یہ ہماری پستی کا ذمہ دار ہے۔ اس سے معاشرہ میں کشمکش پیدا ہوتی ہے۔ اور ہماری اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی زندگی کو کبھی کبھی استقامت نصیب نہیں ہو سکتی۔ اس سے وہ جذبہ نہیں پیدا ہو سکتا جو ملک میں زرعی ترقی کا محرک بن سکے۔ یہ مسئلہ درحقیقت پاکستان کے اقتصادی اور معاشرتی مسائل کی فہرست میں اول نمبر پر رکھے جانے کے قابل ہے۔

اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ خود پلاننگ بورڈ کے نزدیک اس مسئلہ کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔ لیکن اس مسئلہ کے حل کے لئے پلان میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ پیداوار کو قریب ۳ فیصدی بڑھانے کی کوشش کی جائے گی اور ایسے قوانین مرتب کرنے کی ضرورت ہے جن سے زمین کے حقوق منصفانہ طور پر متعین ہو جائیں اور اشتمال اراضیات کے ذریعے چھوٹے چھوٹے رقبوں کو ملا کر بڑے بڑے قطعات میں تبدیل کر دیا جائے۔ ہم ارباب فکر و نظر سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا ملک کا ایسا اہم مسئلہ جو خود پلاننگ بورڈ کے چیئرمین کے الفاظ میں ملک کے اقتصادی اور معاشرتی مسائل میں "نمبر ون" (NUMBER ONE) حیثیت رکھتا ہے ان تدابیر سے حل ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ جس قدر یہ مسئلہ اہم اور بنیادی ہے۔ اسی قدر اس کے حل کے لئے انقلابی اقدامات کی ضرورت ہے۔ اور اس کا امکان صرف ان لوگوں کے ہاتھوں سے ہو سکتا ہے جو اپنے سینے میں صحیح انقلابی روح اور اپنے دل میں عزم بلند رکھتے ہوں۔ انقلابی روح سے ہماری مراد ہے قرآن کی پیدا کردہ انقلابی روح اور عزم بلند سے مراد ہے ایسا عزم جو قرآنی ایمان پیدا کرتا ہے۔ یہ روح اسی شخص کے قلب میں بیدار اور یہ عزم اسی کے سینے میں استوار ہو سکتا ہے جو الارض للّٰہ کے قرآنی تصور کو پوری طرح سمجھنے کے بعد اس کی اہمیت کو دل کی گہرائیوں میں اتار چکا ہو۔ نیست ایں کار فقیہاں اے پسر!

اس ضمن میں ایک بات اور بھی قابل غور ہے۔ آجکل ہمارے ہاں کا سرمایہ دار طبقہ از خود زمینداری کو چھوڑ کر کارخانہ داری کی طرف آ رہا ہے۔ ہمارے مصلحین نے یہ روش اختیار کر رکھی ہے کہ وہ زمینداروں کے مظالم کو ایک ایک کر کے گنتے اور زمینداری کی اصلاح کے لئے نت نئی تجاویز پیش کرتے رہتے ہیں لیکن کارخانہ داروں کے متعلق ایک حرف بھی نہیں کہتے۔ حالانکہ خرابی حالات دونوں جگہ یکساں ہے۔ چڑھتے سورج کی پرستش اسے کہتے ہیں۔ اب اقتدار زمینداروں کے ہاتھ نہیں، کارخانہ داروں کے ہاتھ میں ہے۔

طریق کار پلان میں جو تجاویز پیش کی گئی ہیں، ظاہر ہے کہ انھیں بروئے کار لانے کے لئے وسائل و ذرائع کی ضرورت ہوگی۔ ان کے بغیر کوئی تجویز کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اس ضمن میں پلان میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ اس قسم کے (PLANS) کی کامیابی کے لئے دو قسم کے طریق اختیار کئے جاسکتے ہیں۔ ایک طریق یہ ہے کہ

> یہ سمجھ لیا جائے کہ ملت کے تمام وسائل و ذرائع (RE SOURCES) ان مقاصد کے حصول کے لئے موجود ہیں۔ پھر تمام افرادِ ملت سے کہا جائے کہ وہ محنت شاقہ سے کام کریں۔ ان مصائب و تکالیف کو برداشت کریں جو ان بلند مقاصد کے حصول کی راہ میں پیش آئیں۔ اپنی ضروریاتِ زندگی کو کم از کم حد تک گھٹا لیں۔ حکومت جس فرد کے متعلق سمجھے کہ وہ فلاں قسم کا کام کرنے کا اہل ہے اسے اس کام پر حکماً لگا دے اس طریق کار کا مطلب یہ ہوگا کہ افرادِ ملت پر زیادہ سے زیادہ پابندیاں عائد کی جائیں تاکہ ان کی جسمانی اور انسانی صلاحیتیں بڑی سے بڑی حد تک پیش نظر نصب العین کے حصول میں صرف کی جاسکیں۔

آپ دل میں خوش ہو رہے ہوں گے کہ شکر ہے کہیں سے یہ آواز تو کان میں آئی کہ ہمارے حالات کا تقاضا یہ ہے کہ انفرادی مفاد اور آرام کو پس پشت ڈال کر ملک کے تمام وسائل و ذرائع کو ملت کے اجتماعی مقاصد کے لئے وقف کر دیا جائے۔ لیکن ہمیں افسوس ہے کہ آپ کی یہ خوشی چشمک برق سے زیادہ دیر پا ثابت نہ ہوگی اس لئے کہ مذکورۂ صدر طریق کی وضاحت کے بعد ہمارے سامنے یہ الفاظ آتے ہیں کہ

> ہمارا ملک فردی آزادی اور جمہوری اندازِ حکومت کا قائل ہے اور مذکورہ بالا طریق ان دونوں کے منافی۔ اسلئے یہ ہمارے ملک کے مزاج کے سازگار نہیں ہوسکتا چنانچہ ہم نے اس طریق کار کو مسترد کر دیا ہے۔
>
> اس کے بجائے ہم نے دوسرے طریق کار کو ترجیح دی ہے۔ جس کی رو سے لوگ ترقی کے کاموں کے لئے اپنے دل کی مرضی سے جو کچھ دیں، اسی کے مطابق تخمینے مرتب کئے جائیں۔

فردی آزادی کا جو مفہوم ان حضرات نے سمجھ رکھا ہے اس کے احساس سے ہمیں نہ صرف تاسف بلکہ سخت صدمہ ہوا۔ چار آدمی پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر رہے ہیں۔ ایک شخص کے پاس پانی سے بھرا ہوا مشکیزہ ہے جس میں سے وہ صرف ایک چلو بھر پانی اپنی مرضی سے دینے کے لئے تیار ہے۔ ان حضرات کے نزدیک فردی آزادی کا تقاضا یہ ہے کہ ان چار انسانوں کو العطش العطش کہتے ہوئے ہلاک ہونے دیا جائے۔ لیکن اس سے پانی کا آدھا مشکیزہ زبردستی نہ لیا جائے۔ باقی رہا جمہوری اندازِ حکومت کا تقاضا سو اس ضمن میں ہمیں انگریزی کی یہ مثل یاد آگئی کہ

یعنی خود بادشاہ سے بھی زیادہ تخت و تاج کا وفادار (MORE LOYAL THAN THE KING

ہم نے جمہوری اندازِ حکومت اہل مغرب (بالخصوص انگریزوں) سے سیکھا ہے گزشتہ جنگ عظیم کے دوران میں اور اس کے بعد جنگ سے پیدا شدہ خلاء کو پورا کرنے کے لئے انگریزوں نے اپنے ملک کے افراد پر جس جس قسم کی پابندیاں لگائیں اور ان کے معیارِ زندگی کو جس حد تک گھٹایا اس سے ہر وہ شخص باخبر ہے جس نے ان تفصیلات کا مطالعہ کیا ہے یا جس نے اس زمانہ میں اس ملک کو ایک نظر دیکھا ہے۔ ملک میں صنعتی پیداوار کی رفتار تیز سے تیز تر کر دی گئی تھی۔ لیکن اس تمام پیداوار کو دوسرے ملکوں میں بھیجا جاتا تھا۔ اور ملک کے اچھے اچھے خوش حال لوگ صابن کی ایک ٹکیہ

یا چاکولیٹ کے ایک ٹکڑے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھا کرتے تھے۔ ٹیکسوں کا یہ عالم تھا کہ ایک روسی تنقید نگار کے الفاظ میں ایک ٹیکس دہندہ انکم ٹیکس افسر سے درخواست کرتا تھا کہ میری ساری آمدنی آپ لے لیجئے اور اس میں سے انکم ٹیکس آپ مجھے دے دیجئے۔ اس لئے مختلف ٹیکسوں کی مجموعی تعداد بعض حالات میں متعلقہ آمدنی کے اسی فیصدی تک پہنچ جاتی تھی اور ٹیکس مرنے کے بعد بھی پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ ان تمام قانونی پابندیوں سے نہ تو ان لوگوں کی انفرادی آزادی پر کوئی حرف آیا اور نہ ہی جمہوریت میں کوئی جھول پڑا۔ ہمارے ملک کے حالات کسی طرح بھی ان حالات سے کم شدید اور نازک نہیں جو حالات جنگ یا جنگ کے بعد ان ممالک میں رونما ہوئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم گذشتہ آٹھ نو سال سے ایک سرد جنگ! (COLD WAR) کی حالت سے گذر رہے ہیں۔ ان حالات کو سدھارنے کے لئے ملک کے سرمایہ دار طبقہ نے بطیب خاطر جو کچھ کیا ہے اس سے کون بے خبر ہے لیکن اس کے باوجود ہمارے ارباب حل و عقد کا ارشاد ہے کہ ان لوگوں سے زبردستی کچھ نہ لیا جائے کیونکہ یہ جمہوریت کے منافی ہے۔ ہمیں ڈر ہے کہ اگر یہ ذہنیت اسی طرح کار فرما رہی اور کل جنگ چھڑ جانے کی صورت میں ہمیں جبری بھرتی (CONSCRIPTION) کی ضرورت پیش آئی تو یہ حضرات کہیں یہ نہ کہہ دیں کہ یہ اقدام فرد کی آزادی کے منافی ہے! اگر فرد کی آزادی کا مفہوم یہی ہے تو ہم ان حضرات سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ لوگوں سے انکم ٹیکس کیوں وصول کیا جاتا ہے؟ جبکہ ہمیں معلوم ہے کہ (باستثنائے چند) کوئی شخص دل کی رضامندی سے انکم ٹیکس ادا کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اور ہزار قسم کے حیلوں بہانوں سے اس سے بچ نکلنے کی راہیں تراشنے کی فکر میں رہتا ہے۔ اس حد تک تو ان حضرات کے نزدیک انفرادی آزادی پر کوئی زد نہیں پڑتی۔ لیکن اگر اس سے ایک قدم اور آگے بڑھنے کی ضرورت پیش آئے تو پھر فرد کی آزادی بھی سلب ہو جاتی ہے اور جمہوری انداز کا حلیہ بھی بگڑ جاتا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس قسم کی ذہنیت غیر شعوری طور پر کن تاثرات کی غمازی کرتی ہے؟ مغرب کی جمہوری حکومتوں نے روس کے خلاف جو پروپیگنڈہ کیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم لوگ اس حد تک پابندیوں کو جمہوری سمجھتے ہیں جنہیں یہ مغربی ممالک جائز قرار دیں اور اس سے ایک قدم آگے بڑھنے کو "ڈکٹیٹر شپ" سمجھ لیتے ہیں۔ ہماری حالت تو بلکہ یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ملک میں کوئی بھوکا ننگا نہیں رہنا چاہیئے تو اس کے متعلق اس طرح کنکھیوں سے اشارے ہونے لگ جاتے ہیں گویا وہ روس کا ایجنٹ ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم اس قسم کی ذہنیت کو اپنے قلب و دماغ سے جھاڑ کر نکال دیں۔ اور ہر معاملہ کا فیصلہ آزادانہ طور پر کریں۔ اسلام فرد کی آزادی اور احترام انسانیت کا سب سے بڑا علمبردار ہے۔ وہ معاشرہ کو فرد کی ذات کی نشوونما کا ذریعہ قرار دیتا ہے۔ لیکن وہ اس حقیقت سے بھی چشم پوشی نہیں کرتا کہ معاشرہ فرد کے تحفظ و بقا کے لئے جو کچھ کرے گا وہ انہیں وسائل و ذرائع کی مدد سے کرے گا جنہیں وہ افراد سے حاصل کرے گا۔ اس مقصد کے لئے وہ افراد کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کرتا ہے کہ ہر فرد دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتا ہے۔ اس قسم کے معاشرہ میں افراد سے کچھ لینے کے لئے کسی قسم کی زبردستی کی ضرورت ہی نہیں پڑتی لیکن جس معاشرہ میں حالت یہ ہو کہ

ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش

اس معاشرہ میں یہ کہنا کہ بھیڑیوں کو قانونی سلاسل کا پابند کرنا ان کی انفرادی آزادی کے منافی ہے معاشرے کو درندگی کی آماجگاہ بنا دینا نہیں تو اور کیا ہے۔ بنابریں پاکستان کو تباہی اور بربادی سے بچانے کیلئے ہر فرد سے وہ کچھ لے لینا جو اس کی جائز ضروریات سے زیادہ ہو انفرادی

آزادی کے منافی قرار نہیں پا سکتا۔ ان افراد سے یہ کچھ لے لینا درحقیقت خود ان کی اور ان کی نسلوں کی حفاظت کے لئے ہے۔ اس میں دیکھنا صرف یہ چاہیئے کہ قوم سے یہ کچھ لینے والے ارباب نظم و نسق اسے قوم کی فلاح و بہبود کے لئے صرف کریں۔ اپنے مفاد اور اقتدار کے لئے غصب کر لیں اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی چاہیئے کہ اپنی آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت صحیح قرآنی خطوط پر کریں تاکہ وہ اپنے معاشرہ ہی کی نہیں بلکہ پوری نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے اپنا سب کچھ وقف کر دیں۔ یہ وہ جماعت مومنین ہوگی جن سے کچھ بھی زبردستی لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ مال تو ایک طرف، وہ اپنے سر کو بھی ہتھیلی پر لئے لئے پھریں گے کہ وہ کس طرح انسانیت کی فوز و فلاح کے کام آ سکتے ہیں۔ اسلام جس معاشرہ کا تصور پیش کرتا ہے وہ کمیونزم سے کہیں آگے اور بلند ہے اسلئے ہمیں اس قسم کی باتیں کرتے ہوئے اس احساس سے شرمانا نہیں چاہیئے کہ مغربی جمہوریتیں ہمارے متعلق کیا کہیں گی۔ یہ لوگ اسلام کی اخوت و مساوات کی تعلیم کو جان بوجھ کر کمیونزم قرار دیتے ہیں تاکہ مسلمان اپنے ہاں وہ قرآنی معاشرہ قائم نہ کر لیں جو سرمایہ داری کی حرکات سے۔ یہ روش کچھ عصر حاضر کی اقوام ہی کا شیوہ نہیں یہ طعن خود نبی اکرم کے زمانہ میں بھی دیا جاتا تھا۔ علامہ اقبال نے جاوید نامہ میں کہا ہے کہ ابو جہل کعبہ کا غلاف تھام کر اپنے خداؤں سے نوحہ کرتا تھا کہ

ایں مساوات، ایں مواخات اعجمی است　　　　خوب می دانم کہ سلماں مزدکی است

لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ نہ مزدکیت اسلام تھی اور نہ کمیونزم اسلام ہے۔ کمیونزم جن بنیادوں پر قائم ہے ان کی رو سے ایک مسلمان کبھی کمیونسٹ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اسلام مساوات نہیں سکھاتا۔

اس ضمن میں ایک اور بات بھی ہمارے سامنے آتی ہے جس کا تذکرہ اس مقام پر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ محترم زاہد حسین صاحب نے اپنی اس تقریر میں جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے یہ بھی فرمایا کہ

> "میں سمجھتا ہوں کہ اسلام اس عدم مساوات کو تسلیم کرتا ہے جس کی بنیاد جوہر ذاتی (MERIT) پر ہو جیسا کہ قرآن نے کہا ہے کہ خدا نے بعض انسانوں کو دوسروں پر فضیلت دی ہے۔ میرے خیال میں کسی نظام معاشرہ کے محنتی اور ذی قوت ہونے کے لئے اس قسم کی عدم مساوات ضروری ہے لیکن اس اختلاف اور تفاوت کو معقول حدود کے تابع رہنا چاہیئے۔ وہ عدم مساوات جو غیر معاشرتی رسوم و مسالک کی پیدا کردہ ہو یا جو اس وجہ سے پیدا ہو کہ مختلف افراد کو یکساں مواقع نہیں ملے تھے یا وہ عدم مساوات جو معاشرہ کی ضروریات سے زیادہ ہو یا اس کے خلاف جائے وہ ناجائز بھی ہے اور نقصان رساں بھی۔" (پاکستان ٹائمز ۳ رجون ۱۹۵۶ء)

اس ضمن میں گذارش ہے کہ قرآن مختلف افراد میں اکتساب رزق کی استعداد کے فرق کو تسلیم کرتا ہے لیکن وہ اس فرق کو نہ تو معاشرہ میں کسی فضیلت کا موجب قرار دیتا ہے اور نہ ہی افراد کو اس زائد کمائی کا مالک۔ جہاں تک معاشرہ میں عزت اور تکریم کا تعلق ہے وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ قانون خداوندی کی رو سے وہ فرد سب سے زیادہ واجب التکریم ہے جو سب سے زیادہ قانون خداوندی کی اطاعت اور اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرتا ہے ان اکرمکم عند اللہ اتقکم باقی رہا استعداد کے فرق کی بناء پر کمائی میں فرق تو اس کے متعلق قرآن کی پوری آیت (جس کے صرف ابتدائی چند الفاظ کا ترجمہ محترم زاہد حسین صاحب نے اپنی تقریر میں پیش کیا ہے) یوں ہے۔

وَاللّٰهُ فَضَّلَ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ فِي الرِّزْقِ فَمَا الَّذِيْنَ فُضِّلُوْا بِرَآدِّيْ رِزْقِهِمْ عَلٰى مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَهُمْ فِيْهِ سَوَآءٌ اَفَبِنِعْمَةِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (۱۶/۷۱)

مختلف افراد میں رزق پیدا کرنے کی استعداد کا فرق خدا کی طرف سے ہے (تمہارا اپنا پیدا کردہ نہیں) جس کی وجہ سے مختلف کے حصول (رزق) میں فرق ہوتا ہے۔ لیکن جن لوگوں کو اس طرح معاشی فضیلت حاصل ہو جاتی ہے وہ اس زائد پیداوار کو ان لوگوں کی طرف نہیں لوٹاتے جو اپنی کم استعداد کی وجہ سے ان لوگوں کی زیر نگرانی کام کرتے ہیں۔ وہ ایسا اس لئے نہیں کرتے کہ ان کا ذہن اس تصور کو قبول نہیں کرتا کہ اس طرح معاشرہ میں سب برابر ہو جائیں۔ یہ ذہنیت درحقیقت خدا کی طرف سے دی ہوئی نعمتوں سے انکار کرنا ہے۔

اس وقت اس حقیقت کی تشریح کی گنجائش نہیں کہ قرآن نے یہ کہہ کر کہ یہ لوگ اپنی زائد کمائی کو دوسروں کی طرف نہ لوٹا کر خدا کی دی ہوئی نعمتوں سے انکار کرتے اور اس طرح اس کے خلاف محاذ جنگ قائم کر لیتے ہیں، کتنی عظیم واقعاتی حقیقت (FACTUAL REALITY) کا اعلان کیا ہے۔ چنانچہ اس نے کہا ہے کہ جب نظام سرمایہ داری کے نمائندہ، قارون سے کہا گیا کہ وہ سارے کے سارے رزق کو اپنی ملکیت کیوں سمجھتا ہے تو اس نے کہا کہ میں ایسا کیوں نہ سمجھوں؟ مجھ میں کمانے کی استعداد زیادہ ہے اس لئے میں نے زیادہ کمایا ہے یعنی یہ سب کچھ مجھے اپنی ہنرمندی سے ملا ہے (قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (۲۸/۷۸)) یہی کچھ ہر سرمایہ دار کہتا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہی ذہنیت درحقیقت اس تمام فتنہ و فساد کی جڑ ہے (بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ)۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اکثر لوگ اس حقیقت کو جانتے نہیں (وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۹/۴۹))۔ کسی انسان کا ذہین و فطین ہونا اس کی اپنی پیدا کردہ خوبی نہیں۔ یہ خوبی خدا کی عطا کردہ ہے۔ لہٰذا اس خوبی کی بنا پر جو کچھ زائد حاصل ہو اسے اپنی ذاتی ملکیت سمجھ لینا خدا کی عطا کردہ نعمت سے انکار اور خدا کے خلاف جنگ ہے۔ بہرحال یہ بات ضمناً سامنے آ گئی تھی جسے کچھ بیان کرنا ضروری سمجھا گیا (ان امور کی تفسیر ادارہ طلوع اسلام کی طرف سے شائع کردہ کتاب "نظام ربوبیت" میں ملے گی)

ہونا کیا چاہیئے؟

ہمارے نزدیک ایک اسلامی جمہوریہ کے لئے پلان مرتب کرنے کے سلسلہ میں سب سے پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اس جمہوریہ کے فرائض اور ذمہ داریاں کیا ہیں۔ قرآن کی رو سے ایک ایسے نظام مملکت کے فرائض جو اپنے آپ کو خدا کے نام پر قائم کرتا ہے یہ ہیں کہ

(۱) اس مملکت میں کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریات زندگی (روٹی۔ کپڑا۔ مکان وغیرہ) سے محروم نہ رہے۔

(۲) ہر فرد کی صلاحیتوں کی پوری پوری نشو و نما کیلئے ضروری انتظامات کئے جائیں۔ تاکہ کسی فرد کی کوئی استعداد دبی ہوئی نہ رہ جائے۔

(۳) افراد معاشرہ کی تعلیم و تربیت کا ایسا انتظام کیا جائے کہ ہر فرد نوع انسانی کی فلاح و بہبود کے لئے اپنا سب کچھ وقف کر دینے کو اپنی زندگی کا فریضہ سمجھے۔

(۴) تمام افراد معاشرہ کو پورا پورا انصاف ملے اور بلا قیمت ملے۔

یہ ہیں ایک اسلامی مملکت کی ذمہ داریاں۔ ظاہر ہے کہ یہ ذمہ داریاں پوری نہیں ہو سکتیں جب تک رزق کے سرچشمے اس مملکت کی تحویل میں نہ ہوں جو اس نظام کے قیام کے لئے وجود میں آئی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ ایک دن میں نہیں ہو سکتا۔ یہ منزل بہ منزل ہوگا۔ اس کے لئے بہترین طریق کار پلاننگ ہے۔ یعنی جو کچھ کرنا مقصود ہے اس کی ایک تفصیلی فہرست مرتب کر لی جائے۔ پھر اسے تین تین سال یا پانچ پانچ سال کے حصوں میں

بانٹ لیا جائے۔ اور یہ متعین کر لیا جائے کہ پہلے تین (یا پانچ) سال میں ہمیں کہاں تک پہنچنا ہے۔

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوگا کہ اس پروگرام کو عمل میں کون لائے۔ ایک ناپختہ قوم میں مغربی انداز جمہوریت جو گل کھلاتی ہے۔ اس کا تماشا ہم گزشتہ آٹھ نو برس میں دیکھ چکے ہیں۔ اس لئے اس طریق عمل کو مسلسل قائم رکھنا حماقت ہوگا۔ اسے بہرحال بدلنا ہوگا۔ جتنی جلدی اسے بدل لیا جائے اتنا ہی اچھا ہوگا۔ ہمارے نزدیک بہترین طریق کار یہ ہوگا کہ

(۱) ہم اپنے پلان کو مکمل شکل میں مرتب کر کے اس کا تعین کر دیں کہ ہم نے پہلے تین (یا پانچ) سال میں کہاں تک پہنچنا ہے۔ اس کے بعد ملک میں اعلان کر دیا جائے کہ جو لوگ اپنے اندر اس تین (یا پانچ) سالہ پروگرام کی تکمیل کی ہمت اور صلاحیت پاتے ہوں وہ رئیس مملکت کے منصب کے لئے بطور امیدوار آگے بڑھیں۔

(۲) ان امیدواروں میں سے ایک کو عام انتخاب کے ذریعہ بطور رئیس مملکت چن لیا جائے اور اسے کلی اختیارات دیدیئے جائیں کہ وہ اپنے لئے اپنے وزیر، مشیر اور دیگر رفقائے کار خود مقرر کرے۔ کسی کو اس میں کوئی دخل نہیں ہوگا۔

(۳) وہ اپنے ان رفقاء کی مدد سے جس طرح چاہے اس پروگرام کی عملی تشکیل کرتا جائے۔ تین (یا پانچ) سال کے بعد عام انتخابات کے ذریعے ایک کمیشن مقرر کیا جائے جو اس امر کا جائزہ لے کہ وہ پروگرام اپنی متعین منزل تک پہنچ چکا ہے یا نہیں۔ اگر پہنچ چکا ہو تو ہوالمراد۔ اگر کمیشن دیکھے کہ رئیس مملکت کے تساہل، تغافل یا بددیانتی کی وجہ سے پروگرام کی تکمیل نہیں ہو سکی تو پھر اسے سزائے موت نہیں تو کم از کم عمر بھر کیلئے قید کی سزا دی جائے۔

(۴) اس کے بعد اگلی منزل کے لئے پھر اسی طریق کار کو دہرایا جائے۔

ہمارے نزدیک بحالات موجودہ یہی طریق کار نتیجہ خیز ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی بات غیر اسلامی بھی نہیں۔

بزم ہائے طلوع اسلام

جون سنہ ۱۹۵۶ء کے پرچہ میں استدعا کی گئی تھی کہ محترم پرویز صاحب کے دوران سفر لاہور، سیالکوٹ اور راولپنڈی کے اجتماعات میں جو تقاریر کی تھیں۔ ان کا ملخص ایک مسلسل اور مربوط تقریر کی شکل میں بصورت پمفلٹ

"معاشی مسئلہ کا قرآنی حل"

کے عنوان سے علیحدہ شائع کیا جا رہا ہے۔ لہٰذا تمام بزم ہائے طلوع اسلام بہت جلد مطلع فرمائیں کہ انہیں اس پمفلٹ کی کس قدر کاپیاں مطلوب ہیں۔ بعض لوگوں کے جوابات موصول بھی ہو چکے ہیں۔ پمفلٹ اب چھپ کر تیار ہے۔ بزم ہائے طلوع اسلام سے استدعا کی جاتی ہے کہ اپنی اپنی ضرورت کے مطابق یہ پمفلٹ فوراً طلب فرمالیں۔ یہ پمفلٹ ۲۰×۳۰ سائز میں سفید کاغذ پر چھپا ہے۔ ضخامت ۱۲ صفحات ہے۔ اور قیمت فی کاپی صرف ایک آنہ ہے (علاوہ محصول ڈاک)

ناظم ادارہ طلوع اسلام